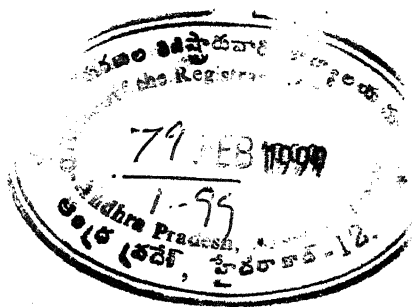


کِرچی کرچی خواب



محمد انیس فاروقی

Phone : 3561831

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

اب ایک پیچیدہ تخلیقی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے ایسے عمل کے نتیجے میں ایسی تخلیق وجود میں آتی ہے جس میں ہمہ گیر دل و دماغ کو چھونے اور نئی تاثیر پیدا کرنے کی طاقت ہوتی ہے تو وہ ادب پارہ پارہ شہ پارہ بن کر زمانے زمانے تک پڑھا سمجھا اور سراہا جاتا ہے۔ انیس فاروقی کی کہانیوں کا مجموعہ ”ریزہ ریزہ چاندنی“ ایک ایسی ہی ہلکی پھلکی دلچسپ کہانیوں کا مجموعہ ہے یہ سب مقصدی ادب کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔

۱۔ و۔ شا کرہ، حیدرآباد

(بہترہ روزنامہ ”سیاست“ حیدرآباد)

”ریزہ ریزہ چاندنی“ میں شامل کہانیاں مسائل پر مبنی ہیں۔ جنہر کا مسئلہ ہوا اس مادیت پرست و اعلیٰ انسانی اقدار اور سماجی وقار سے محروم دنیا میں حقوق البائپر مبنی مسائل، آج ایسی کہانیوں کی سماج اور فرد دونوں کو خاص ضرورت ہے۔

(بہترہ ”راشٹریہ سہارا“ نئی دہلی)۔

انیس فاروقی کی کہانیوں کے کردار اف لوی نہیں حقیقی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں کہانیوں میں اختصار زندگی ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنی بات کو کم سے کم وقت میں کہنا چاہتے ہوں۔ اس افتادِ طبع کا ایک سبب شاید یہ بھی ہو کہ وہ سہول الجیز ہیں عمارتوں کے نقشے بناتے بناتے ان عمارتوں میں مقیم لوگوں کی زندگیوں کے خاکے کھینچنے کیلئے وقت نکال لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا شاید انہیں علم ہو کہ

خاموشیاں بھی اک دن مٹنے اپنا کھولتی ہیں

گو نگے طیس کیس تو دیواریں بولتی ہیں

تمہیں سلطانہ ایم۔ اے۔ (ریسرچ اسکالر)۔

بحقی مصنف محفوظ

حقوق

کرجی کرجی خواب

نام کتاب ۹۱.۴۳۲

سنہ اشاعت ۱۹۹۸ ANE

پانچ سو

پہلا ایڈیشن

سید اسد بخاری، فرید آرٹس ہمدی پٹنم حیدر آباد

سرورق

شکیل کمپوزنگ سنٹر، سعید آباد

کمپیوٹر

المہدی پرنٹرس، جمال مارکٹ، چھتہ بازار

طباعت

مصنف

ناشر

آندھرا پردیش اُردو اکیڈمی حیدر آباد

جزوی مالی اعانت

ساتھ روپے (= 60 Rs)

قیمت

”نورِ حبیب“ ۹۲/۶۱ - ۴ - ۹

ملنے کا پتہ :-

معراج کالونی، ٹولی چوکی، حیدر آباد

۲۔ ہمالیہ بک ڈپو، ناہیلی بازار

درگاہ یوسفین روڈ، حیدر آباد۔ ۵.....۱

Acc. No.
470

۳

انتساب

برادر محترم

جناب محمد ایوب فاروقی صاحب صابر
کے نام

جن کی رہنمائی و ہمت افزائی نے
میرے شوقِ افسانہ نویسی کو جلا بخشی۔

محمد انیس فاروقی



فہرست

۶	پیش گفتار	۱
۹	ابتداء کرتا ہوں اس کے نام سے	۲
۱۱	جواب	۳
۱۶	چاہت کی جیت	۴
۲۱	انوکھا فیصلہ	۵
۲۶	ہم نے یوں ہی نہیں چاہا تم کو	۶
۴۲	کِرچی کِرچی خواب	۷
۵۱	نئی صبح	۸
۵۹	فاصلے سمٹ گئے	۹
۷۱	فرق	۱۰
۷۷	شع	۱۱
۱۰۰	بہورانی	۱۲

سرد پلوں کی صلیبوں سے اُتارے ہوئے خواب
ریزہ ریزہ ہیں میرے سانسِ شیشوں کی طرح



ہمارے ہاں شعر و ادب میں، جن محدودے چند اصناف نے نئی سمتوں پر سفر جاری رکھا ہے، کچھ نکھر گئی ہیں، کچھ مہک گئی ہیں اور ان کے وزن و وقار میں اضافہ بھی ہو گیا ہے۔ مختصر افسانہ ان میں سے ایک ہے۔ رومانی افسانے، مقصدی افسانے، ٹائپ افسانے اور روایتی افسانوں سے قطع نظر اشاریتی افسانے تجریدی افسانے، اینٹی افسانے، پلاٹ لس افسانے اور۔۔۔۔۔ غرض ان دنوں ہر نوع کے افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ لایعنی اور بے معنی افسانے بھی۔!۔۔۔۔۔ ایسے میں وہ فنکار بھی ہیں جو نئے میلانات اور رجحانات سے قطع نظر اپنے آپ میں گمن، اپنے انداز سے لکھ رہے ہیں اور اچھا بھی لکھ رہے ہیں۔ ایسے ہی فنکاروں میں محمد انیس فاروقی بھی ہیں۔

محمد انیس فاروقی گذشتہ (۲۰)۰ (۲۵) برسوں سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”ریزہ ریزہ چاندنی“ ۱۹۹۳ میں شائع ہوا اور اب وہ اپنے افسانوں کا دوسرا مجموعہ پیش کر رہے ہیں ”کرچی کرچی خواب“۔۔۔۔۔ افسانہ نگاری کے اپنے اس سفر میں انہوں نے ایک دنیا دیکھی ہو لیکن ان کے افسانوں کے موضوعات، ان کی قصا، افسانہ نگاری کے رویہ اور ان کی زبان، لہجہ و اسلوب میں کم ہی تبدیلی آئی ہے۔ انیس فاروقی نے اپنے لئے ہلکے پھلکے گھریلو رومانی موضوعات کو گویا منتخب کر رکھا ہے۔ ان

کے زیادہ تر افسانے ایسے ہی ہیں۔ چچا زاد، پھوپھی زاد، خالہ زاد اور ماموں زاد بہن بھائی (کبھی کبھی کچھ اور بھی لیکن صرف کبھی کبھی) متوسط طبقہ، معاشرتی اقدار خاندانی تقدیس کو برقرار رکھتے ہوئے بندھے نکلے دائروں میں محدود محبت، مرکزی کردار زیادہ تر انجیتر اور پس منظر میں مشرق وسطیٰ کی ملازمتیں۔۔۔ ایسے میں انہوں نے ”نوکھا فیصلہ“، ”فاصلے سمٹ گئے“ اور ”شمع“ جیسے طریقہ افسانے بھی لکھے ہیں اور ”کرچی کرچی خواب“ جیسے المیہ افسانے بھی۔ اور ”ہم نے یونہی نہیں چاہا تم کو“، ”نئی صبح“ اور ”فرق“ جیسے افسانے بھی جو المیہ ہوتے ہوتے طریقہ بن گئے۔ ہاں اس مجموعہ کے دو افسانے ”جواب“ اور ”چاہت کی جیت“ ان کے افسانوں کے عمومی مزاج سے جدا گانہ ہیں۔ موضوعاتی افسانے کہہ لیجئے۔ ”جواب“ کو میں کچھ زیادہ ہی اہمیت دوں گا۔ دہشت گردی کے موضوع پر یہ افسانہ المیہ ہے۔ افسانہ نگار نے صرف افسانہ نگاری نہیں کی بلکہ بتایا ہے کہ دہشت گردی کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ افسانہ متاثر کرتا ہے۔ ”چاہت کی جیت“ مخالف جمیز قانون کے غلط استعمال کا احاطہ کرتا ہے۔ انیس فاروقی نے کچھ اور ہی زاویہ سے کام لیا ہے کہ لڑکی والے بھی اس قانون کا کیسا استحصال کرتے ہیں۔ افسانہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔۔۔ میں یہاں انیس فاروقی کے افسانوں کے پہلے مجموعے ”ریزہ ریزہ چاندنی“ کے دو تین افسانوں کا تذکرہ ضرور کروں گا۔ اس مجموعہ میں بھی ایسے ہی گھریلو محبت کے افسانے زیادہ ہیں۔ قطع نظر ان کے ”آزاد مملکت“ انیس فاروقی کا پہلا افسانہ ہے لیکن ان کا یہ ایک عمدہ افسانہ ہے اور ”انعام“ اور ”پرائی خوشبو“ بالترتیب جمیز اور برتھ کنٹرول سے متعلق ہیں۔ انہوں نے ہماری معاشرت کی دکھتی رگوں کو پھیرا ہے اور بڑی حد تک اچھے پیرایہ میں۔۔۔۔

انیس فاروقی کے افسانوں کی ایک نمایاں خوبی روایت کا پاس و لحاظ، معاشرتی اور تہذیبی اقدار کا احترام اور ایک پاکیزہ گھریلو فضاء کی تخلیق ہے جو دلکش بھی ہے اور دلآویز بھی۔۔۔۔ یہ جو ان دنوں شعر و ادب میں بے راہ روی اور اقدار کی پامالی ملتی ہے

اس سے انہوں نے خود کو محفوظ رکھا ہے جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے۔ انیس فاروقی کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ الفاظ کے مزاج کو ملحوظ رکھنا کا صحیح سیاق و سباق میں استعمال، یہ ہنر ان کو خوب آتا ہے۔ رواں ہوا، شیریں اسرار شاعری لیا ہوا پیرایہ بیان کہ قاری ان کے افسانوں کی دنیا میں کھوسا جاتا ہے۔ اپنے جانے پہچانے ماحول اور کرداروں کے علاوہ گھلاوٹ اور حلاوت لیا ہوا اسلوب ان کے افسانوں کو پرکشش بنادیتا ہے۔ قاری کے لئے دلچسپی کے اس سامان سے ہر افسانہ مزین ہے اور قاری یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایسے افسانے پڑھ چکا ہے ہر افسانہ میں جاذبیت محسوس کرتا ہے کہ افسانہ ختم کئے بغیر چین ہی نہیں آتا۔ یہ افسانہ نگاری کی بڑی کامیابی ہے۔ مزید برآں ان کے موضوعات خواہ کچھ ہوں ان کے ہاں افسانہ پن ملتا ہے۔ اس دور میں جب کہ افسانہ سے افسانہ پن ختم ہوتا جا رہا ہے ایسے افسانے اپنی مرتبہ رکھتے ہیں۔

میں انیس فاروقی سے صرف ایک بات عرض کرونگا۔ اور بھی دکھ ہیں زما۔ میں محبت کے سوا زندگی کے کئی رخ، کئی پہلو ہیں۔ وہ زندگی کو کچھ اور زاویوں سے بھی دیکھیں ”جواب“، ”چاہت کی جیت“، ”آزاد مملکت“، ”النعام“ اور ”پرانی خوشبو“ کی طرز اور کئی موضوعات ہیں جو منتظر ہیں کہ انیس فاروقی اس طرف متوجہ ہوں۔ ان کے پڑھ اور پسند کرنے والے ان سے یہ بھی چاہتے ہیں۔

سلیمان اطہر جاوید

۲۷ / ستمبر ۱۹۹۸ء

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ٹولی چوکی، حیدرآباد، ۵۰۰۰۰۸

ابتداء کرتا ہوں اس کے نام سے

میرے افسانوں کے پہلے مجموعہ ”ریزہ ریزہ چاندنی“ کی حیدر آباد کے ادبی حلقوں میں جس طرح سے پذیرائی کی گئی وہ میرے لئے حوصلہ افزاء رہی۔ اس مجموعہ کی رسم اجراء جدید لب و لہجہ کے نامور افسانہ نگار جناب عوض سعید مرحوم کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس موقع پر ممتاز افسانہ نگار ڈاکٹر بیگ احساس اور نقاد قدیر الزماں نے مجموعہ میں شامل کہانیوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ بعد میں ”سیاست“ حیدر آباد میں محترمہ ا۔ و۔ شاکرہ اور ”راشٹریہ سہارا“ دہلی میں ادارہ کی طرف سے ان کہانیوں پر حوصلہ افزاء تبصرے شائع ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ حیدر آباد اور دیگر مقامات سے ادبی ذوق کی حامل شخصیتوں نے بھی میرے افسانوں اور کہانیوں پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی آراء روانہ کیں۔ ان تمام کی حوصلہ افزائیوں نے مجھے بھرپور حوصلہ بخشا جس کے نتیجے میں آج میں اپنے افسانوں اور کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ”کرچی کرچی خواب“ لینے قارئین کی خدمت میں اس امید کے ساتھ حاضر ہو رہا ہوں کہ میرے پہلے مجموعہ کی طرح اس مجموعہ کو بھی ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

چند ادیبوں اور نقادوں کے خیال میں آج کے ادیب کو قاری کی ذہنی سطح سے اونچا اٹھنا چاہیئے۔ بات راست کہنے کے بجائے ابہام کا سہارا لینا چاہیئے۔ گفتگو اشاروں اور کنایوں میں ہو، فن کو تجریدی ہئیت اختیار کرنی چاہیئے، غالب نے بھی بیان کے لئے اسالیب میں دستوں کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن اگر ادب کو زندگی کے قریب ہونا ہے۔ سماج اور معاشرے میں بکھرے مسائل کا تجزیہ کرنا ہے اور ناپسندیدہ قدروں کی صرف نشان دہی نہیں معاشرے میں صحت مندرجہانات کو پھیلانا ہے تو قاری کے ذہن کو جھنجوڑنے کے لئے اس کی ذہنی سطح کو نگاہ میں رکھ کر ہی ادب کی تخلیق سودمند ثابت ہوگی۔

آج کے کمپیوٹر دور میں ادب کی تخلیق کا مقصد نہ قارئین کے لئے تفریح طبع ہے

جواب

گرمیت سنگھ ایک انتہائی نیک صفت نوجوان تھا اس نے کامرس میں پوسٹ گریجویشن تک تعلیم حاصل کی تھی اور جب کوئی ڈھنگ کی ملازمت نہ مل سکی تو اس نے اپنا ایک چھوٹا موٹا بزنس شروع کیا جو آہستہ آہستہ ترقی کی منزلیں طے کرتا گیا۔ اس کی انتھک محنت آخر رنگ لائی اور آج اس کا شمار شہر کے ایک کامیاب بزنس مین میں ہونے لگا۔ وہ بچپن ہی سے بہت خاموش طبع کم گو اور اپنے کام سے مطلب رکھنے والا نوجوان تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہوئے کوئی پندرہ بیس برس کا عرصہ بیت گیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب وہ ہائر سکندری کا طالب علم تھا۔ اس کی ماں چونکہ ایک باہمت خاتون تھیں اس لئے وہ اپنی کشتی حیات مصیبتوں کے سمندر کے بھنور میں پھنسنے سے پہلے ہی ساحل تک لے آئیں جس کے لئے انہیں اپنی پرشباب جوانی اپنی اولاد پر قربان کرنی پڑی اور بھری جوانی میں بیوگی کے سفید بے داغ لباس کو اپنا مقدر بنانا پڑا جس کا انعام وہ اپنے گرو نے نیک اور صلح بیٹا گرمیت سنگھ اور سکھر دسلیقہ شعار بیٹی سریندر کور کے روپ میں دیا اور آج وہ تینوں وہے گرو کی کرپا سے قابل رشک زندگی گزار رہے تھے۔ سریندر کور کی شادی ہو چکی تھی اور گرمیت کی شریک حیات کی تلاش جاری تھی۔

گرمیت سنگھ چونکہ کچی عمر میں ہی باپ کے شفیق سائے سے محروم ہو گیا تھا اس لئے بہت حساس طبیعت کا مالک تھا اور اپنے اندر ایک درد مند دل رکھتا تھا، جب کبھی اس کے شہر یا آس پاس میں دہشت گردی کے سبب اموات ہوتیں تو وہ پہلا شخص ہوتا جو متاثرہ افراد خاندان سے ملتا اور اپنی بساط بھران کی مدد کرتا اور انہیں باز آباد کار ہونے تک مالی مدد جاری رکھتا۔ اس کے اس عمل کا پتہ کسی کو نہ ہوتا یہ تو بس وہی جانتا تھا یا پھر اس کے وہے گرو۔ اس کا یہ یقین تھا کہ انسان جب نیک عمل کرے تو یوں کرے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

نہ تخلیق کار کے اپنے ادبی ذوق کی نمائش۔ کسی ادیب یا افسانہ نگار کی کوئی ایک تخلیق ہی اگر معاشرہ کے کسی ایک فرد کی اصلاح کر دے تو میں کہوں گا کہ اس ادیب یا افسانہ نگار نے اپنے قلم سے معاشرے کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا حق ادا کر دیا۔ عصری حیات صرف ماحول کی خرابیوں کا احساس رکھنے ہی کا نام نہیں اس کی اصلاح کا کام بھی ہے۔ اور یہی ادب جو سماج اور معاشرے میں انقلاب برپا کر دے اصل ادب ہے۔

اس مجموعہ میں شامل اگر میری ایک کہانی ہی معاشرے کے کسی ایک فرد کو متاثر کر دے تو میں سمجھوں گا کہ میری یہ کاوش کامیاب ہوئی اور مجھے میری کاوشوں کا انعام مل گیا جیسا کہ اس سے قبل بھی میں نے کہا تھا کہ میری کہانیوں اور میرے افسانوں کے کردار ہیں جیتے جاگتے کردار جو میرے آس پاس ہیں کچھ ٹوٹے دلوں کی داستانیں کچھ یاس میں ڈوبی تمناؤں کے خاکے۔

صرف کاغذ پہ یہ بکھرے ہوئے الفاظ نہیں عکس ہے ان میں کئی ڈوبی تمناؤں کا

اس امید کے ساتھ اپنا یہ دوسرا مجموعہ ”کرچی کرچی خواب“ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ اس بار بھی میری ہمت افزائی کی جائے گی۔

میں شکر گزار ہوں آندھرا پردیش اردو اکیڈمی، حیدر آباد کا جس کے جزوی مالی تعاون کے باعث یہ مجموعہ شائع ہو سکا۔

میں مشکور ہوں جناب پروفیسر سلیمان اطہر جاوید صاحب کا جنھوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود اس مجموعہ میں شامل میری کہانیوں اور افسانوں پر اپنے زرین خیالات کا اظہار کیا۔ میں شکر گزار ہوں جناب محمد عارف الدین صاحب کا جن کے زرین مشوروں نے اس کتاب کی کتابت تزئین میں میری مدد فرمائی۔

محمد انیس فاروقی

سراج کالونی، ٹولی چکی، حیدر آباد

کیوں اپنا جی ہلکان کئے جا رہا ہے اگر وہاں ہے گردو چاہے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ انہوں نے جب پیار سے سمجھایا تو وہ اٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔

کل کا یہ واقعہ اس کے ذہن سے جیسے چمٹ کر رہ گیا تھا وہ اس قدر متاثر تھا کہ اس نے اپنے کاروبار بھی چند دنوں کے لئے بند رکھے۔ اسی درمیان اس کے ذہن میں ایک تجویز ابھری کہ کیوں نہ ایک ایسی تنظیم بنائی جائے جس سے دہشت گرد افراد کو معمول کی زندگی میں لوٹ آنے کی ترغیب دی جائے، چند ہی دنوں کی افہام و تفہیم کے بعد وہ اپنے چند دوستوں کو ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ انہوں نے مل کر ایک فورم تشکیل دی۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ لوگ جو بھی کام کریں گے اس کی تشہیر نہ کی جائے گی، ہر کام راز میں رکھا جائے گا، اس کے ایک ساتھی نے کہا ”اگر شک کی بنیاد پر پولس ہمیں بھی دہشت گرد سمجھ کر گرفتار کر لے گی تو کیا ہوگا؟“

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو“ ایک اور ساتھی نے کہا ”لیکن اس کا بھی راستہ ہے ہمارے پاس کیوں نہ ہم سرکار کی بھی مدد حاصل کر لیں، ہم حکومت سے یہ بھی مطالبہ کریں گے کہ ہمارے تصویری شناختی کارڈ متعلقہ محکمہ جات کو بھیج دیئے جائیں تاکہ یہ خدشہ بھی دور ہو جائے۔“

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ گرمیت سنگھ نے کہا اس کے لئے ہم ریاستی وزیر سماجی بہبود سے رجوع کریں گے اور اپنے اس فورم کے لئے حکومت کی سطح پر بھی تحفظ حاصل کریں گے“

”جب کوئی کام صدق دل سے کیا جاتا ہے جو کہ نیک نیتی پر مبنی ہو اور کام کرنے والے بے لوث ہوں تو وہاں ہے گردو اس میں ضرور کامیابی عطا کرتے ہیں“ گرمیت سنگھ اپنے ساتھیوں سے اکثر یہی کہتا اور ہوا بھی ایسا ہی۔ وہ لوگ جب ریاستی وزیر سے ملے اور اپنے فورم کی تشکیل کے بارے میں ان سے بات کی اور ان کی سرپرستی چاہی تو وزیر موصوف بہت خوش ہوئے وہ ان سب کو گلے لگا کر مبارکباد دیتے رہے اور ان کے

آج صبح صبح جب اس نے اخبار پڑھا تو اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل چیر ڈالا ہو۔ اخبار کے پہلے ہی صفحہ پر جو خبر چھپی تھی اسے پڑھ کر اس کا دل گویا خون کے آنسو رونے لگا، اس کے جگر کی دوست اور بچپن کے ساتھی ہر مندر سنگھ کے گھر پر کل رات دہشت گردوں نے حملہ کیا تھا اور اس کے بوڑھے پتا کے ناتواں جسم کو گولیوں سے بھونک دیا تھا اور جب اس کی جوان بہن کی عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی گئی تو اس نے اپنے ہی گھر کے کنویں میں چھلانگ لگا کر جان دیدی تھی۔ اخبار میں مزید تفصیل کچھ یوں بیان کی گئی تھی کہ ہر مندر سنگھ نے کبھی کسی دہشت گرد کے خلاف عدالت میں گواہی دی تھی تب سے وہ لوگ اس کی جان کے پیچھے پڑ گئے تھے اور کل رات بھی اسی کی تلاش میں اس کے گھر پر حملہ کیا تھا لیکن چونکہ ہر مندر گھر پر موجود نہ تھا اس لئے جذبہ انتقام نے اپنا کام کر دکھایا۔ گرمیت سنگھ اس خبر کو پڑھ کر مسوت سا بیٹھا رہ گیا تھا اور اس کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ بیٹے کو اس طرح بیٹھا دیکھ کر اس کی ماں اس کے قریب آئی تو دیکھا وہ رونے کے قریب تھا۔ انہوں نے اسے خود سے قریب کرتے ہوئے پوچھا کیا بات ہے پتر تو کیوں رو رہا ہے؟

گرمیت نے آج کا اخبار ان کے آگے کر دیا اور پوچھا ”ماں یہ کیسا جنون ہے کہ بیٹے کا بدلہ اس کے بوڑھے باپ اور جوان بہن سے لیا جائے۔ آخر اس درندگی سے حاصل کیا ہے“ آخر یہ لوگ چاہتے کیا ہیں کیوں ایسی آگ بھیلار ہے ہیں جو ساری قوم اور ملک کو اپنی پلیٹ میں لینے لگی ہے اور ہمارے سارے معاشرے کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کرنے لگی ہے۔

ہاں پتر تو جو کہہ رہا ہے وہ سچ ہے۔ واسے گرد ہی ان لوگوں کو سیدھا راستہ دکھائے گا۔ نجانے انہیں کیا مل جاتا ہے کسی ماں کی گود سونی کر کے کسی ساگن کی مانگ کا سندور مٹا کر کسی بہن کے بھائی کو چھین کر اور کسی باپ کو بیٹے سے جدا کر کے، کچھ بھی تو انہیں حاصل نہیں ہو پاتا پھر یہ لمورنگ ہولی کیوں کھیلی جا رہی ہے، پر پتر تو

کے اعلیٰ عہدیداروں کو بھی اس بابت مطلع کر دیا تھا تاکہ اگر انہیں پولس کی مدد درکار ہو تو وہ بہ آسانی مل سکے۔ حسب پروگرام وہ وہاں پہنچے اور بڑی منت سماجت کے بعد اپنی بات شروع ہی کی تھی کہ پولس نے دھاوا بول دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے فائرنگ کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ اس غیر متوقع واقعہ پر گرمیت سنگھ اور اس کے دو ساتھی بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ انتہائی غصہ کی حالت میں پولس کے اعلیٰ عہدیدار کے گھر پہنچے تو وہاں کا منظر دیکھ کر انہیں جہاں بے حد تعجب ہوا وہیں ان کا خون بھی کھول گیا۔ پولس کے اعلیٰ عہدیدار کے گھر شراب اور شباب کی محفل جمی تھی، جہاں پولس کے اعلیٰ عہدیداروں کے ساتھ چند سیاسی نیتا بھی موجود تھے، ان میں سے جب ایک نیتا نے کہا، کمشنر صاحب بڑے چلے تھے اصلح کرنے، کم بختوں نے ہمارا سارا دانہ پانی بند کر دیا رکھا تھا، ساری زندگی عذاب کر ڈالی تھی سالوں نے۔ آج انہیں ان کے اصلی ٹھکانوں پر پہنچا دیا گیا ہے جہاں ان کا واسطہ گردان کے نیک کرموں کا پھل انہیں دے رہا ہوگا۔ پھر ان ساروں کا ملا جلا ققمہ فصفا میں ابھرا تو اس کی گونج سے گرمیت سنگھ اور اس کے دونوں ساتھیوں کو یوں لگا جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ ان کے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔ وہ تینوں غصہ کی آگ میں جھلس اٹھے، پھر ان تینوں کے ریوالور سے گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی، چند لمحوں بعد ہی وہ سارے موت کی وادی میں جاسوئے تھے۔

دوسرے دن کے اخبار کی سرخیاں کچھ یوں تھیں۔ کمشنر پولس کے گھر خطرناک دہشت گردوں کا حملہ، کمشنر پولس اور چند سیاسی نیتا دہشت گردوں کی فائرنگ سے ہلاک دہشت گرد بچ نکلنے میں کامیاب، پولس کو ان کی تلاش، پتہ بتانے والے کو پانچ لاکھ روپے کا نقد انعام، ادھر گرمیت سنگھ کو اس کے ذہن میں ابھرے سارے سوالوں کا جواب مل گیا تھا کہ آخر دہشت گرد، دہشت گرد کیوں بتاتا ہے؟

جذبہ خدمت خلق کی داد بھی دی اور سراہا بھی انہوں نے کہا کہ وہ ہمیشہ ان کے ساتھ ہیں۔ انہیں جس طرح کی مدد درکار ہو وہ انہیں ضرور پہنچائیں گے اور ان کیلئے مکمل تحفظ بھی فراہم کیا جائے گا۔ انہوں نے گرمیت سنگھ اور اس کے چاروں ساتھیوں کے تصویری شناختی کارڈ بھی بنا کر انہیں بھیجنے کا وعدہ کیا اور ان کی تصاویر کی کاپیاں اپنے پاس رکھ لیں۔ وزیر موصوف نے اپنا وعدہ وفا کیا اور گرمیت سنگھ کے نام ان کا خط شناختی کارڈز کے ساتھ ملا جس میں اس کار خیر کو شروع کرنے پر انہیں اپنی شبہ کامنائیں بھیجی تھیں۔

گرمیت سنگھ اپنے چاروں ساتھیوں کے ساتھ اصلاح دہشت گرد کام میں جٹ گیا، وہ لوگ اپنے بنائے ہوئے طریقہ اور اصول پر کاربند ہو گئے، رات کے کسی بھی پہر میں وہ خفیہ طور پر نکلتے اور دہشت گردوں کے کسی نہ کسی ٹھکانے پر پہنچ جاتے، انہیں بجھاتے کہ جو راستہ انہوں نے اپنایا ہے اس کا انجام صرف اور صرف برا ہی ہے۔ اس لئے وہ اس مجرمانہ راستے کو ترک کر دیں اور پھر سے عام آدمی کی طرح زندگی کی ہمانی میں جٹ جائیں۔ ہر ایک کے دکھ درد میں شامل ہو جائیں ان کی بے لوث محنت رنگ لانے لگی اور آہستہ آہستہ پہلے چند دہشت گرد اپنی زندگی کو بدلنے میں کامیاب ہوئے پھر ان کی تعداد میں قابلِ لحاظ اضافہ ہوتا گیا، دہشت گردوں کی زبانی گرمیت سنگھ جب ان حالات کے بارے میں سنا جنہوں نے انہیں دہشت گرد بننے پر مجبور کیا تو اس کی آنکھیں فرط حیرت سے پھیلنے لگتیں اور کبھی کبھی واقعات اتنے شرمناک بھی ہوتے کہ وہ سن کر اپنی گردن شرم سے جھکا لیتا۔ پھر اسے ان معصوم نوجوانوں پر بے حد ترس آتا کہ جنہیں محض اپنے مفاد کی خاطر ایسے خطرناک دلدل میں ڈھکیل دیا گیا جس سے بچ نکلنے کے متعلق وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔

آج رات گرمیت اور اس کے ساتھیوں نے دہشت گردوں کی ایک بہت ہی خطرناک ٹولی سے بات کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے پولس

میرا موکل یونیورسٹی میں لکچرر ہے اور ساری یونیورسٹی کو اس نوجوان لکچرر پر ناز ہے۔ وہ اس لئے کہ اس نے اپنے اخلاق اور کردار سے اپنی شخصیت بنائی ہے جس میں نہ کوئی جھول ہے اور نہ ہی کوئی داغ۔ یور آئر اس کیس کے سلسلے میں جتنے بھی گواہوں کے بیانات قلمبند کئے گئے ہیں وہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ ایک دولت مند باپ اپنی دولت کے بل بوتے پر قانون کو غلط طریقہ پر استعمال کرتے ہوئے ایک معصوم اور بے گناہ نوجوان کی زندگی اور اس کے مستقبل سے کھیلنا اور کھلاڑ کرنا چاہتا ہے۔ ایک قانون جسے عورت کے تحفظ کیلئے سرکار بناتی ہے اس کے غلط استعمال کرنے کی یہ عدالت اجازت نہیں دے سکتی، جس پر مخالف قانون کا سہارا لیکر میرے موکل کو پریشان اور حراساں کیا جا رہا ہے اور اسے ناکردہ گناہ میں پھانسنے کی سعی کی جا رہی ہے، بس یور آئر مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے، وکیل صفائی نے اپنی بحث ختم کی، عدالت کی کارروائی ایک ہفتہ کے لئے ملتوی کرتے ہوئے جج صاحب اپنی نشست سے اٹھ کر چلے گئے۔

کاشف یونیورسٹی میں لکچرر تھا۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ انتہائی خوددار اور اصول پسند نوجوان تھا۔ دیکھنے میں خوبصورت اور جاذب نظر بھی، کوئی ایک سال قبل اس کی شادی شہر کے ایک بہت بڑے بزنس مین سیٹھ ہاشم صاحب کی صاحبزادی ناظمہ سے ہوئی تھی یوں تو ناظمہ طبیعت کے لحاظ سے بہت اچھی لڑکی تھی لیکن چونکہ دولت مند گھرانے میں پروان چڑھی تھی اسی لئے کچھ شاہ خرچ بھی تھی ویسے تو ان دونوں میں آپسی سمجھ بوجھ اور اچھا تال میل تھا اس نے بہت حد تک خود کو کاشف کے گھریلو ماحول میں ایڈجسٹ کر لیا تھا لیکن کبھی کبھار اس کی کسی خواہش کا احترام کاشف اس لئے بھی نہیں کر پاتا تھا کہ وہ ایک محتاط قسم کا نوجوان تھا، وہ اس بات میں یقین رکھتا تھا کہ آدمی کو اپنے پیرائے ہی پھیلانے چاہیئے جتنی کہ اس کی چادر ہو۔ یہ اصول کامیاب زندگی گزارنے کی علامت بھی ہے۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ایک شریک حیات ہونے کے ناطے

چاہت کی جیت

یور آنر ملزم ایک ایسا مجرم ہے جو انسانیت اور سماج کیلئے بد نما داغ اور ناسور بن گیا ہے آپ دیکھئے یور آنر۔ ملزم دیکھنے میں ایک سیدھا سادہ معصوم چہرہ اور شرافت کا لبادہ اوڑھے کھڑا ہے لیکن یہ نوجوان ایک ایسے کردار کا مالک ہے جو ایک معصوم اور فرشتہ صفت لڑکی پر مزید جہیز کے لئے دباؤ ڈالتا رہا اور اس کی زندگی اجیرن کر دی، محبوبہ لڑکی کے والدین کو اس انسانی روپ میں چھپے بھیرے کے چنگل سے چھڑانے کیلئے واپس اپنے گھر لے جانا پڑا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو بہت ممکن تھا کہ ایک معصوم لڑکی کو جہیز کی ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا۔ یہ لڑکی جو آج اپنے افراد خاندان کے درمیان کسی محفوظ پناہ گاہ کی طرح بے خوف و خطر جی رہی ہے پتہ نہیں کتنے عرصہ قبل ڈھیروں خاک تلے دفنادی جاتی۔ اس کے لئے انہیں کیا چاہیئے تھا بس پڑول کی چند بوندیں اور دیا سلائی کی ایک سلائی یور آنر۔۔۔ میری عدالت سے یہی درخواست ہے کہ اس مجرم کو ایسی سزا دی جائے جو سماج کیلئے عبرت کا مقام ہو تاکہ کوئی اور اس طرح کے اقدام کی جرات نہ کر سکے۔۔۔ یہ کہتے ہوئے پبلک پراسیکیوٹر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

مجھے اس بات پر سخت اعتراض ہے یور آنر۔۔۔ میرے فاضل دوست شاید یہ بھول رہے ہیں کہ جب تک میرے موکل کا جرم ثابت نہیں ہو جاتا اسے کوئی جرم نہیں کہہ سکتا۔ میرے موکل پر جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔ اینٹی ڈاوری ایکٹ (Anti Dowry Act) کا سہارا لیکر ایک شریف النفس اور باعزت نوجوان کے مستقبل کو تباہ اور برباد کرنے کی یہ سوچی سمجھی سازش ہے یور آنر۔۔۔ میرا موکل ایک باکردار نوجوان ہے وہ ایک قابل احترام اور باعزت پیشہ یعنی پیشہ تدریس سے وابستہ ہے۔ یہ ان نوجوان کی تربیت کرتا ہے جو آگے چل کر ملک اور قوم کا سرمایہ ثابت ہوتے ہیں۔

ناظمہ اس کے بنائے ہوئے اصولوں پر کاربند رہے۔ ویسے ناظمہ کو اس کے بنائے ہوئے اصول و ضوابط بھی پسند تھے اور وہ کاشف کو دل و جان سے چاہتی بھی تھی، ان کی زندگی پر سکون اور قابل رشک گذر رہی تھی لیکن کبھی کبھی کچھ کھٹ پٹ اور ہلچل بھی ہو جاتی لیکن وہ دونوں بہت جلد سمجھوتہ کر لیتے، کاشف یہ کہتا کہ چھوٹی موٹی کھٹ پٹ کے بغیر زندگی میں کیا لطف باقی رہ جائے گا۔ انسان یکسانیت سے بہت جلد ادب جاتا ہے اور ایسی ہی ایک معمولی بات اتنی طول پکڑی کہ سیڈھ ہاشم نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا اور ادھر کاشف کسی بھی قیمت پر اپنی خود داری کا سودا کرنے کیلئے تیار نہ ہوا۔ اپنے باپ اور بھائی کی بے جا ضد اور ہٹ کے آگے ناظمہ چلہتے ہوئے بھی کاشف سے نہ مل سکی۔ انہوں نے طے کر لیا کہ وہ ضرور کاشف کو ایسا سبق سکھائیں گے کہ وہ ساری عمر پچھتاوے کی آگ میں جھلستا رہے۔ سیڈھ ہاشم نے اپنے ایک دوست کے مشورے پر ایک جھوٹا کیس بنا کر کاشف کو پھنسا یا اور اس پر مزید حمیز کی مانگ کا الزام لگا کر حمیز مخالف قانون کے تحت گرفتار کروایا اور پھر مقدمہ عدالت میں چلنے لگا۔

پبلک پراسیکیوٹر دو کیل صفائی کی بحث اور تمام گواہوں کے بیانات سننے کے بعد جج صاحب نے کہا میں اپنا فیصلہ دینے سے قبل ایک بار محترمہ ناظمہ صاحبہ سے چند سوال کرنا چاہوں گا۔ جج صاحب کے آرڈر پر ناظمہ کو دینٹس باکس میں بلایا گیا۔ اس کیلئے چونکہ یہ پہلا اتفاق تھا اس لئے وہ کچھ نزوس اور پریشان پریشان سی تھی اور لمبے میں شرابور ہونے لگی پھر اس نے اپنی ساری ہمت جیسے جمع کی اور آکر دینٹس باکس میں کھڑی ہو گئی پھر جج صاحب اس سے سوال کرنے لگے۔

میں چند سوالات تم سے پوچھوں گا اور تم بغیر کسی خوف و خطر اور فکر و تردد کے سچے جواب دو گی۔ پھر انہوں نے اس سے پوچھا ”اپنی شادی شدہ زندگی میں تم نے جتنا عرصہ مسٹر کاشف کے ساتھ گزارا اس عرصہ میں کیا تمہارے شوہر نے کوئی شکایت کا موقع فراہم کیا؟“

جی نہیں جج صاحب، مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں رہی۔

کیا انہوں نے کبھی مزید جہیز لانے کا مطالبہ کیا اور آپ کو مراساں کرتے رہے جیسا کہ پولس کو دی گئی شکایتی درخواست میں کہا گیا ہے۔

”جی نہیں، انہوں نے کبھی کسی بھی قسم کا مطالبہ نہیں کیا“ ناظمہ نے سچ کا سہارا لیا، پھر جھگڑا کس بات پر ہوا، تمہیں ان سے کیا شکایت ہے، کیا تم علیحدگی چاہتی ہو۔

”جج صاحب سچ بات تو یہ ہے کہ ہمارے بیچ کوئی جھگڑا ہی نہیں ہے، شکایت مجھ کو میرے شوہر سے نہیں بلکہ اس قانون سے اور اس قانون کے رکھوالوں سے ہے، جو اپنے ضمیر کا سودا کر کے اس قانون کا غلط استعمال کر رہے ہیں اور کاشف جیسے خوددار نیک صفت اور اصول پسند نوجوانوں کی زندگی برباد کر کے ان کے مستقبل کو تاریک کر رہے ہیں، میرے والد جیسے دولت مند لوگ پولس کو خرید کر اس طرح کے جھوٹے کیس رجسٹرڈ کر رہے ہیں اور جہیز مخالف قانون کا سہارا لے کر اپنی جھوٹی انا کی تسکین کی خاطر کاشف جیسے نوجوانوں کی زندگی سے کھلواڑ کر رہے ہیں، مجھے کاشف سے کوئی شکایت نہیں ہے، میں ان کے ہمراہ زندگی گزارنے میں خوشی محسوس کرتی ہوں کیونکہ میں نے ان جیسا خوددار انسان دیکھا نہیں ہے، مجھے ان سے اور ان کی خودداری اور ان کے اصولوں سے بے حد پیار ہے میری آپ سے درخواست ہے کہ جج صاحب کچھ کریئے۔ اس قانون کا سہارا لے کر بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں کی زندگی تاریکیوں کے بھنور میں پھنستی جا رہی ہے“ اتنا کہتے ہوئے وہ جذباتی ہو کر بلک پڑی اور آٹھ سو اس کی پلکوں کے باندھ توڑ کر اس کے رخسار پر لڑھک آئے جنہیں وہ باوجود ضبط کرنے کے روک نہ سکی تھی۔

جج صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھرنے لگی۔ پھر انہوں نے کیس خارج کرتے ہوئے کاشف کو باعزت بری کر دیا۔ پھر کاشف نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ ناظمہ کو دیکھا جو اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے بہت قریب آیا

انوکھا فیصلہ

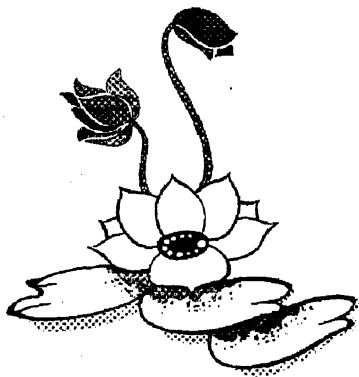
ترطاح : فرحین کا ہاتھ فضا میں لہرایا اور ایک دھماکہ سا ہوا اور جاوید کے کھردرے گال پر اس کے نازک ہاتھ کی چاروں انگلیوں کے نشان ابھر آئے۔ یہ واقعہ اتنا غیر متوقع ہوا تھا کہ دفتر میں بیٹھے ہر فرد کی توجہ ان دونوں کی جانب مبذول ہو گئی اور سارا اسٹاف ان کے قریب جمع ہونے لگا۔

جاوید کو فرحین سے اس طرح کے رد عمل کی توقع نہ تھی، وہ بس اسے گھور کر رہ گیا۔ ”یہ طمانچہ تمہیں بہت منگنا پڑے گا مس فرحین“ اس نے دل میں خود سے کہا۔

مسٹر جاوید بد تمیزی کی بھی ایک حد ہوتی ہے، میری شرافت کے باعث آپ نے تمیزی کی حدوں کو پار کرتے ہوئے ایک نیک صفت انسان پر اپنے ذہن کی گندگی کو اچھالنے کی کوشش کی ہے۔ میری وجہ سے کسی کی نیک نامی مجروح ہو یہ میں قطعی برداشت نہیں کر سکتی، سمجھے آپ“ وہ شعلہ بار نظروں سے جاوید کو دیکھتی ہوئی اپنے کین میں چلی آئی جہاں ڈرائنگ بورڈ پر چرٹھا کمرشیل کا مپلیکس کا ڈرائنگ اس کی فنکاری کا منظر تھا، جسے آج ہی تکمیل کرنا تھا۔ پھر وہ اپنے کام میں جٹ گئی۔

فرحین معمار کنسٹرکشن کمپنی میں گزشتہ تین برسوں سے کام کر رہی تھی، اس نے آرکٹیکچر میں ڈگری حاصل کی تھی اور پھر اس کے ٹیلنٹ کو دیکھتے ہوئے معمار کنسٹرکشن کمپنی نے معقول تنخواہ پر بحیثیت اسٹنٹ آرکٹیکٹ ملازمت دی تھی۔ معمار کمپنی کے بے شمار رہائشی اور کمرشیل کا مپلیکس شہر کے ہر نمایاں مقام پر زیر تعمیر تھے۔ کمپنی والوں نے بڑی جدوجہد کے بعد مارکٹ میں اپنی ساکھ بنائی یہ محض ایک اتفاق ہی تھا کہ اس کے مرحوم والد کے دوست ہاشم چچا کے بڑے لڑکے شوکت بھائی بھی اس کمپنی میں اچھی پوسٹ پر فائز تھے، انہیں یہاں دیکھ کر اس میں احساس تحفظ جاگنے لگا تھا، شوکت نہ

اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا ”نازو۔۔ مجھے تم پر ناز ہے۔۔“
 سے ہم پھر ایک نئی زندگی شروع کریں۔“ پھر وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کمرہ
 باہر چلے گئے ”ناظمہ کی امی نجمہ بیگم نے دور تک انھیں جاتے ہوئے دیکھا، وہ
 نگاہ نیلے آسمان کی طرف اٹھی تو انہوں نے دیکھا پرندوں کا ایک جوڑا آہستہ
 منزل کی جانب رواں دواں تھا، پھر سکون اور طمانیت بھری مسکراہٹ ان کے
 پھیلتی چلی گئی۔



(اس کہانی نے راشٹریہ سھارا نئی دہلی کے
 نویسی کے انعامی مقابلہ میں دوسرا انعام حاصل

اس سے پوچھ گچھ ہوگی۔ اس نے کل رات ہی اپنے استغنیٰ کی درخواست تیار کر لی تھی وہ اپنی نشست سے اٹھی اور اپنے ہاتھوں میں نیلے رنگ کا لفافہ تھامے ایم ڈی صاحب کے اجلاس پر جا پہنچی۔

”السلام علیکم سر!“ اس نے بہت ادب و احترام سے انہیں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔ مس فرحین آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھ جائیے“ انصاری صاحب نے شفقت بھرے لہجے میں کہا تو وہ بیٹھ گئی۔

”دیکھئے مس فرحین مجھے کل وقوع پذیر ہوئے واقعے کا علم ہوا ہے ہمارے آفس میں اس قسم کا واقعہ ڈسپلن شکنی کا باعث ہے اور آفس کی نیک نامی متاثر ہو سکتی ہے میں آپ سے وجوہات جانتا تو نہیں چاہتا لیکن یہ ضرور چاہوں گا کہ اس قسم کا کوئی واقعہ مستقبل میں وقوع پذیر نہ ہو“ انصاری صاحب نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں سر آپ بیشک درست فرما رہے ہیں لیکن سر یہ تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب جاوید صاحب جیسے گندی ذہنیت کے حامل فرد آپ کے آفس میں نہ رہیں۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں سر کیا کسی جوان سال و خوبصورت لڑکی کو اپنے حالات کی مجبوری کے باعث اور اپنے خاندان کی کفالت اور ملازمت کرنے کیلئے گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہئے۔ یہ سماج جس میں مردوں کی اجارہ داری ہے کیوں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ضرورت مند خواتین اور نوجوان لڑکیاں جو کہ پیشہ ملازمت اختیار کرنے کیلئے گھر کی چار دیواری کے باہر قدم رکھنے کیلئے اس لئے مجبور ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کے عمر پر ہمدردی کا آنچل رکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اپنے خاندان اپنی بوڑھی بیمار ماں اور چھوٹے زیر تعلیم بھائی بہنوں کی کفالت کے لئے جب وہ گھر سے باہر قدم رکھتی ہے تو اسے بھوکی اور تندیہ نظروں سے تাকা جاتا ہے۔ اپنے ذہن کی گندگی اچھال کر اس کے بے داغ اور پاک دامن کو داغدار کیا جاتا ہے۔ کیوں سر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا عورت صرف عورت ہے وہ تو ہر مرد کی ماں ہے بہن ہے بیوی ہے اور بیٹی ہے وہ تو مریم

صرف اعلیٰ کردار کے مالک تھے بلکہ شادی شدہ اور دو پھول جیسے خوبصورت بچوں کے باپ بھی تھے، فرحین بہت ہی محتاط رہتی اور دفتر میں کسی سے بھی زیادہ میل ملاپ اور غیر ضروری گفتگو سے پرہیز کرتی لیکن چونکہ شوکت اس کے مرحوم والد کے قریبی دوست کے صاحبزادے تھے وہ ان سے کسی قدر بے تکلف تھی، دفتر میں کام لے اوقات میں جب کبھی فرصت ملتی تو وہ وقت شوکت صاحب کے ساتھ گزارنے میں خوشی محسوس کرتی۔ شوکت ہی ایک ایسے شخص تھے جو کہ اس کے گھریلو حالات سے واقف تھے اسی لئے وہ فرحین کو بہت پسند بھی کرتے تھے کہ اس باہمت لڑکی نے برے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔

جاوید جو کہ کمپنی کے اکاؤنٹس دیکھتا تھا اور کنوارا بھی تھا، اس سے یہ بات برمی عجیب و غریب لگتی کہ فرحین تو کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی لیکن جب دیکھو شوکت صاحب کے پاس گھسی رہتی ہے، یہ جاوید کے اپنے ذہن کی اختراع ہی تھی کہ فرحین کا شوکت صاحب کے ساتھ زیادہ ملنا جلنا اور گفتگو کرنے کو وہ کچھ اور ہی رشتے سے منسوب کرتا۔ آدمی کا ذہن اگر گندگی کا پلندہ ہو تو ایسے شخص سے کسی اچھی بات کی توقع رکھنا بے سود ہوتا ہے، چنانچہ آج کا واقعہ بھی اس کے گندے ذہن کی تخلیق ہی کا رد عمل تھا، اس نے اپنے خیالات کی گندگی سے فرحین کے پاک دامن کو داغدار کرنے کی جب ایک ناکام سعی کی تو فرحین کا خون کھول گیا۔ شدت غم و غصہ میں اس کا ہاتھ فضا میں لہرایا اور ایک بھرپور طمانچہ اس نے جاوید کو رسید کر دیا۔

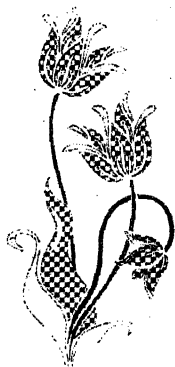
آج کے اس غیر متوقع واقعے کی تفصیل جب معمار کنسٹرکشن کمپنی کے ایم ڈی جناب انصاری صاحب کو معلوم ہوئی تو انہیں بے حد صدمہ ہوا کہ ان کے دفتر میں اس طرح کی غیر اخلاقی حرکت ہوئی ہے۔ انہوں نے وجوہات جانتے کیلئے مناسب سہی سمجھا کہ فرحین سے راست بات کی جائے، چنانچہ انہوں نے چہرہ اسی کو حکم دیا کہ فرحین کو بلا لئے، چہرہ اسی نے آکر جب فرحین کو مطلع کیا تو وہ سمجھ گئی کہ حذر در کل والے واقعے پر

بھی ہے اور سیتا بھی عورت جو تخلیق کے کرب کو جھیل کر ایک مرد بچے کو جنم دیتی ہے اور وہی مرد بچہ جب بڑا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے اور مرد کہلاتا ہے تو اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کیلئے ایک عورت، ایک لڑکی، ایک بہن اور ایک ماں کے دامن عصمت کو تار تار کر کے اس کی جبین پر بدنامی اور کلکتنی ہونے کا انمٹ داغ لگا دیتا ہے۔ کیا یہی آپ کے سماج کا انصاف ہے سر بولنے سر "اتنا بکتے بکتے اس کی آواز بھاری ہو گئی اور آنکھوں کے پیمانے چھلک پڑے، چند لمحوں بعد جب وہ خود پر قابو پا گئی تو پھر کہنے لگی۔ "سر اس سے قبل بھی میں نے دو اور کنسرکشن کمپنیز میں کام کیا تھا اور ان ہی وجوہات کی بنا پر ملازمت چھوڑ دی تھی۔ آپ کی کمپنی میں نے اسی لئے جینی تھی کہ یہاں کا ماحول مجھے کچھ بہتر لگا تھا لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ مجھے آپ کی یہ ملازمت بھی شاید چھوڑنی پڑے گی۔ سر یہ میرا استعفیٰ ہے۔" اس نے نیلا بند لقا ف انصاری صاحب کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا "اگر آپ کی نظروں میں خطا کار ہوں اور سزا کی مستحق ہوں تو میرا یہ استعفیٰ قبول کر لیجئے گا یہ فیصلہ میں آپ پر چھوڑ دیتی ہوں۔" پھر وہ ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

فرحین چلی گئی تھی لیکن انصاری صاحب کے سارے وجود کو گویا جھنجھوڑ گئی تھی وہ سوچ رہے تھے کہ اتنی نازک اندام اور خوبصورت لڑکی اتنی باہمت اور خوددار بھی ہو سکتی ہے ان کی آنکھیں حیرت زدہ تھیں اور دل اس لڑکی کی پاک دامنی اور بلند کرداری کی گواہی دے رہا تھا۔ اس کے کچھ ہوئے الفاظ کی سچائی گونج بن کر ان کے دل و ذہن میں پھل سی مچا رہے تھے۔ اب ان کا ذہن کسی اور سمت سوچ رہا تھا۔ وہ ایک جوہری کی طرح ہیرے کو پرکھ رہے تھے اور اس نتیجے پر پہنچ رہے تھے کہ فرحین کسی بیش قیمت ہیرے سے کم نہیں، پھر انہوں نے اپنے تئیں ایک فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے کال بیل بجائی اور چہر اسی کو شوکت صاحب کو بلانے کی ہدایت دی، شوکت صاحب جب آئے اور فرحین کے بارے میں جو معلومات انہوں نے فراہم کیں وہ یہ تھیں کہ والد کے

انتقال کے بعد سے اس نے اپنے سارے گھر کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے، گھر پر بچوں کو ٹیوشن دے کر خود تعلیم حاصل کی اور چھوٹے دو بھائیوں کو تعلیم دلواتی رہی۔ ماں ضعیف اور بیمار ہے ان کی بھی بیماری کا علاج بڑی دلجوئی سے کر داتی رہی ہے اور ان کی خدمت کر رہی ہے یہ ساری تفصیلات انہیں مزید حیرت زدہ کرنے کیلئے کافی تھیں، پھر وہ اس باہمت لڑکی کے اعلیٰ کردار کے قائل ہوتے گئے۔

دوسرے دن انصاری صاحب کا فیصلہ جان کر ہراسٹاف کے ممبر کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں کیونکہ انہوں نے جاوید کو ملازمت سے نکال دیا تھا اور ساتھ ہی فرحین کا استعفیٰ بھی قبول کر لیا تھا اور یہی بات ہر ایک کیلئے لمحہ فکریہ بنی ہوئی تھی کہ مس فرحین کا استعفیٰ کیوں قبول کیا گیا جب کہ وہ بے قصور تھیں لیکن چند دنوں بعد جب یہ بات منظر عام پر آئی کہ انصاری صاحب نے فرحین کا استعفیٰ اس لئے قبول کیا ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے خاندان کی ہونے والی ہواب مزید ملازمت کرے۔ انہوں نے اپنی بہن کے لڑکے کیلئے جو کہ انہی کی سرپرستی میں تھا فرحین کا انتخاب کر لیا تھا۔



(اس کہانی نے راشٹریہ سہارا نئی دہلی افسانہ نویسی

کے انعامی مقابلہ میں دوسرا انعام حاصل کیا)

”ہم نے یوں ہی نہیں چاہا تم کو“

شمینہ دونوں بچوں شمرین اور ایاز کو تیار کر کے اسکول کیلئے بھیج کر دم بھر کیلئے سستانے اپنے کمرے میں آکر بستر پر دراز ہو گئی تاکہ کچھ دیر آرام کر لے، آج اس نے پروگرام مرتب کیا تھا کہ الماری جو کہ کباڑیہ کی دکان کی طرح لگ رہی تھی سیٹ کرے گی، کپڑے اور دیگر اشیاء جو کہ بے ترتیب اور بکھری ہوئی تھیں انھیں سلیقے سے الماری میں ترتیب دے گی، آج صبح ہی سے وہ مصروف ہو گئی تھی تاکہ کل رات بنائے ہوئے پروگرام کو عملی جامہ پہنا سکے صبح نماز فجر پڑھ کر اس نے قرآن کریم کی تلاوت کی یہ اس کے روزانہ کا معمول تھا کہ نماز کے بعد وہ سورۃ یسین کی تلاوت بلا ناغہ کرتی اور صبح کی شروعات کرتی تاکہ برکتیں نازل ہوں تلاوت سے فراغت کے بعد اس نے باورچی خانہ کا رخ کیا ناشتہ اور بچوں کے لئے نفعن تیار کیا پھر شمرین اور ایاز کو نیند سے بیدار کر کے انھیں غسل کرایا اور اسکول یونیفارم پہنا کر تیار کرا دیا بچوں کے ساتھ وہ خود بھی ناشتہ سے فارغ ہو گئی اور جیسے ہی اسکول بس کے آنے کا وقت ہوا وہ انھیں لے کر بس اسٹاپ پر آگئی دونوں بچوں کو الوداعی بوسہ دے کر انھیں بس میں سوار کیا اور گھر واپس آگئی، اشنا سب کچھ کرتے ہوئے وہ ہر روز ہی تھک جایا کرتی تھی اور کچھ دیر آرام کرنے پر پھر تازہ دم ہو جایا کرتی تھی یہی اسکا روزانہ کا معمول تھا۔ وہ بہت دنوں سے یہ سوچ رہی تھی کہ الماری جو کہ بے ترتیب سامان سے لدی تھی اسے کچھ سلیقے سے سیٹ کر لے گی۔ تاکہ ضرورت کی اشیاء نکلنے میں سہولت ہو۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کسی چیز کی ضرورت آن پڑی تو الماری میں بکھری چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے اور ضرورت کی چیز ڈھونڈ نکلنے میں غیر معمولی وقت ضائع ہو جاتا اور پھر جھنجھلاہٹ الگ طاری ہو کر موڈ آف کر دیتی۔

شمینہ تقریباً ایک گھنٹہ لیٹی رہی، آنکھیں موندے اپنے سارے بدن کو نرم گدے دار بستر پر پھیلانے ریلیکس (Relax) ہوتی رہی تو اسے یوں لگا جیسے اس کی ساری

توانائی لوٹ آئی ہے، پھر اس نے اٹھ کر باورچی خانہ کا رخ کیا اور ایک کپ چائے بنائی اور آکر برآمدے میں پڑی آرام کرسی پر بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لینے لگی، چائے پینے کے بعد ایک طرح سے وہ تازہ دم ہو گئی اور اب وہ خود میں ہر کام کرنے کی توانائی دھرتی محسوس کرنے لگی تھی، حسب پروگرام وہ اپنی خواب گاہ میں چلی آئی الماری کھول کر سارے کپڑے جو بے ترتیب تھے انہیں باہر نکالا کچھ پرانی کتابیں اور اس کی اپنی ڈائری جو کہ کئی سال پرانی تھی اور اس کے اپنے سرمایہ حیات کا درجہ رکھتی تھی سب کچھ باہر نکال ڈالا کچھ آرائش و زیبائش کا سامان، زیورات کا ڈبہ، میک اپ باکس اور الماری کی نچلی ریک میں کچھ پرانی اور کچھ نئی چپلیں رکھی تھیں شمرین اور ایاز کے بے بی شوز ہر چیز نکال کر باہر رکھ دی اور ساری اشیاء کو جھاڑ پونچھ کر انھیں قرینے سے الماری میں جمانے لگی پہلے اپنے اور بچوں کے کپڑے تہہ کئے اور انھیں الماری کی اوپری ریک میں جگہ دی پھر زیورات کے ڈبے اور میک اپ باکس کو صاف کر کے انھیں لاکر میں رکھا اور دوسری ساری چیزوں کو صاف کر کے انھیں ترتیب وار الماری میں سجا ڈالا، پھر جب وہ مطمئن ہو گئی تو رسٹ وایچ پر نظر ڈالی صرف آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا اور پروگرام کے مطابق اس نے الماری سیٹ کر ڈالی تھی، پھر قریب میں رکھی ہوئی پرانی کتب پر اس کی نگاہ پڑی تو اس نے انھیں بھی الماری کے ایک خالی حصے میں رکھا اور ان ہی کتب میں سے اپنی ڈائری لے کر بستر پر دراز ہو گئی اور ورق گردانی کرنے میں مصروف ہو گئی وہ ایک ایک صفحہ الٹی جاتی اور مغموم ہوتی جاتی۔ اسی ڈائری کے اوراق میں اس کی ماضی کی داستان بکھری پڑی تھی۔ ایک ایک پل ایک ایک لمحہ کا ذکر ان اوراق میں بکھرا ہوا تھا، اس نے جیسے ہی ایک صفحہ الٹا اس کے سینے پر گلاب کا پھول جس کی ساری پنکڑیاں سوکھ کر ڈائری کے اس صفحہ پر اپنا رنگ اور نشان چھوڑ گئی تھیں، اگر دفعتاً پانچ برس کا وہ منظر اسکی نگاہوں میں آتا آیا۔

تمینہ اگر خدا نہ کرے ہم دوبارہ نہ مل سکیں تو یہ گلاب کا پھول تمہیں میری محبت کی یاد دلائے گا خدا را اسے کبھی صلح نہ کرنا میری محبت کا انمول تحفہ جانکر اسے

مضبوط رکھتا۔ کامران نے تازہ گلاب کا پھول اسے تھاتے ہوئے کہا تھا اس وقت کامران کے ہونٹوں پر دلنواز مسکراہٹ رقص کُناں تھی اور چہرے پر اپنی محبوب سے بچھڑنے کا غم، مضحک اور افسردہ افسردہ سا کامران کا وہ چہرہ اسے آج تک یاد ہے۔

اس نے کامران کو دلاسا دیتے ہوئے کہا تھا کامران تمہیں اللہ رب العزت کا واسطہ اس طرح مایوسی کی باتیں تو نہ کیجئے، میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، خدا کی ذات سے مایوس ہونا کفر ہے، اس رب عالی کی ذات سے بے شمار امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ اللہ پر یقین رکھیں انشاء اللہ ہم ضرور یکجا ہوں گے۔ آپ اپنا مستقبل سنوارنے کے لئے وطن و ملک چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب تو نہیں کہ خدا نہ کرے کبھی واپس ہی نہ ہوں گے آپ اس طرح کم ہمتی کی باتیں کریں گے تو میں ٹوٹ کر بکھر جاؤں گی۔“

ارے یلگی! میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ ہم سدا کے لئے بچھڑ رہے ہیں، میں نے تو بس از راہ مذاق یہ کہہ دیا۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں کتنی بہادری ہے تم بے فکر ہو کر رہا کرو میں انشاء اللہ دو سال بعد آؤں گا تو پھر ماموں جان سے تمہارا ہاتھ طلب کروں گا۔

تب وہ کیسے انکار کر سکیں گے، کامران نے یقین کا دل سے کہا، اس کے لہجے کی پختگی بڑے سے بڑے طوفان سے ٹکرانے کی ہمت کا پتہ دے رہی تھی۔ ”اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو میں اللہ رب العزت سے ہمیشہ یہی دعا کرتی رہوں گی کہ تمہارے ہر ارادے میں وہ تمہیں کامیابی سے ہمکنار کرے۔ آمین“ شہینہ نے اپنے دونوں ہاتھ دعاغیر انداز میں اٹھا کر جب کہا تو کامران نے جذباتی ہو کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے انھیں اپنی آنکھوں سے لگایا اور پھر اپنی مہر محبت ان نازک نازک خوبصورت حنائی ہاتھوں پر ثبت کرتے ہوئے کہا۔ ”شہینہ دیکھنا تم میری ہوگی۔ تم میری پہلی چاہت و پہلی آرزو ہو۔ میں امی جان سے کہہ جاؤں گا کہ وہ تمہیں ماموں جان سے میرے لئے مانگ رکھیں۔ اچھا میں اب چلتا ہوں پھر وہ اسکی نگاہوں سے دور ہوتا گیا، یہی اسکی کامران سے آخری ملاقات تھی۔

وہ بستر سے اٹھی اور بڑی احتیاط سے گلاب کے اس سوکھے پھول کو عقیدت

سے اپنی آنکھوں سے لگایا اور ڈائری کے اسی صفحہ میں رکھ کر ڈائری بند کر دی اور تکیہ کے نیچے رکھ دیا۔ اس کی حالت اب کچھ بگڑی جا رہی تھی۔ اس کے دل کا درد آنکھوں کی راہ سے بہنے لگا تھا۔ یادوں کا ایک طوفان سا اچانک ہی اٹھ پڑا تھا۔ ماضی کا ایک ایک پل۔ ایک ایک لمحہ یادوں کے نشتر لائے اس کے دل کو زخمی کرنے لگا تھا ماضی کی یادیں کڑی کرچی اس کے جسم میں پیوست ہو کر اسے کرب میں مبتلا کرنے لگی تھیں۔ دل تھا کہ بے قرار ہوا جا رہا تھا۔ اور آنکھوں سے سیل رواں بہنے لگا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور خود سے مخاطب ہوئی۔ آہ کامران یہ سب کچھ کیا ہو گیا۔ کہ کیا سوچ کر گئے تھے تم مجھ نازک بدن، نازک دل اور کم ہمت لڑکی کو اس بے درد جہاں میں تنہا چھوڑ کر یوں چلے گئے کہ پھر لوٹ کر ہی نہ آئے۔ تم نے پلٹ کر کبھی یہ نہ پوچھا کہ تمہاری شہینہ زندہ بھی ہے اگر وہ زندہ ہے تو کس حال میں جی رہی ہے۔ اتنے پتھر دل تو نہ تھے تم تم جو روٹھے تو سارا زمانہ ہی روٹھ گیا تم جو بچھڑے تو میرا اپنا کوئی سہارہ نہ رہ گیا سب اجنبی ہو گئے سب بیگانے ہو گئے میں نے لاکھ چاہا کہ اپنا دل چیر کر بتا دوں کہ اس دل میں کون بتا ہے۔ اس کے نہاں خانوں میں کس کا نام ہے لیکن کسی نے بھی یہ جلتے کی کوشش نہیں کی نہ می نے اور نہ پاپا نے۔ انھیں تو اپنا حق چاہیئے تھا کیوں کہ انھوں نے مجھے جنم دیا تھا می نے نو مہینے اپنی کوکھ میں میرا بوجھ برداشت کیا تھا اور تخلیق کے درد سے گزری تھیں اور جب میں پیدا ہوئی تو پاپا نے اپنی ساری توانائیاں صرف کر کے مجھے پالا پوسا۔ پروان چڑھایا، پڑھایا لکھایا تو ظاہر ہے انھیں اس احسان کا بدلہ چاہیئے تھا تو اپنی اولاد سے۔ سوانہوں نے اپنی من پسند کی، میرے من میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش بھی نہ کی اس من مندر میں میں نے کسے اپنا دیوتا مانا ہے۔ میں کس کے نام کی مالا چیتی ہوں۔ میرا دل کس کے نام پر دھڑکتا ہے۔ تو کامران مجھے اپنوں ہی نے تم سے چھینا ہے جدا کیا ہے میں صنف نازک کیا کر سکتی تھی۔ ایک مشرقی لڑکی بھلا کیسے اپنے والدین کی مرضی اور چاہتوں سے بغاوت کر سکتی ہے۔ میں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ خود کو منجھار

کے حوالے کر دیا، میں نے سوچا کامران کہ محبت کبھی کبھی قربانی بھی طلب کرتی ہے تو میں نے ماں باپ کی محبتوں کے آگے اپنی محبت قربان کر دی اور وہی کیا جو وہ چاہتے تھے اور آج میں تم سے بچھڑ گئی تم سے جدا ہوئے پانچ برس بیت گئے اور ان پانچ برسوں میں کتنے طوفان آئے اور گزر گئے۔ نہ تم آئے اور نہ ہی تمہارا کوئی پتہ چلا کہ تم کہاں ہو میری زندگی تنکے کی مانند ہواؤں کے روش پر بکھرتی چلی گئی، اس کی آنکھیں سادون بھادوں، برسانے لگیں اور ذہن کا پیچھی ماضی کے افق پر اپنے پر پھیلے دور بہت دور پرواز کرنے لگا۔ کامران اس کا پھوپھی زاد بچپن ہی سے ان دونوں نے ساتھ ساتھ کھیلا تھا اور جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے تو بچپن کے معصوم و بے نام جذبے محبت کا مضمون جان گئے تھے، دونوں کے دل ایک دوسرے کے نام پر دھڑکنا سیکھ گئے تھے، دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی چاہت پنپنے لگی تھی، اور انہوں نے جان لیا تھا کہ محبت کسے کہتے ہیں۔ کن جذلوں کا نام محبت ہے لیکن شاید قسمت ان پر نامہربان تھی کیوں کہ کامران کے ابو ایک معمولی سرکاری ملازم تھے اور شینہ ایک بہت بڑے بزنس مین کی اکلوتی بیٹی تھی، شینہ کے پاپا قدا حسین کاشمر میں بہت وسیع کاروبار تھا، ایسا نہیں تھا کہ وہ بالکل ہی دولت کے پجاری تھے، انھیں اپنی بہن عائشہ خانم سے بھی دلی لگاؤ اور محبت تھی اور اپنے بھانجے کامران سے بھی وہ ان کا ہر لحاظ سے خیال کرتے تھے ضرورت پڑنے پر ان کی مالی مدد سے بھی گریز نہ کرتے لیکن کامران کے ابو طاہر حسین ایک نہایت خوددار اور اصول پسند انسان تھے اور انہوں نے کبھی بھی اپنی امانت اور خودداری کا سودا کرنا منظور نہ کیا تھا، اپنی آمدنی کے حساب سے اپنی چادر پھیلانے میں یقین رکھتے تھے، عائشہ خانم بھی ایک بہت ہی کفایت شعار و فاشعار بیوی تھیں۔ انھیں اپنے شوہر کے مزاج و فطرت کا بخوبی اندازہ تھا سو انہوں نے کبھی یہ نہ چاہا کہ اپنے دولت مند بھائی کے آگے اپنا دست سوال دراز کریں اپنی آمدنی کے حساب سے اپنے اخراجات کا تعین کرتیں اور اپنے شوہر کی مرضی کے آگے خود کو ڈھال لیتیں۔

چنانچہ ان کی ازدواجی زندگی پر سکون اور قابل رشک تھی۔ اللہ نے انھیں دو اولادیں عطا کی تھیں، کامران بڑا تھا اور ملیحہ چھوٹی۔

کامران نے جب انجینئرنگ کا کورس مکمل کر لیا تو خلیجی ممالک جانے کی ٹھان لی۔ اور دن رات کوشش میں لگا رہا۔ اور سیز ایمپلائمنٹ کا کوئی اشتہار ایسا نہ ہوتا جس کی کٹنگ اس کی ڈائری میں نہ ہوتی پھر ہر ماہ وہ مختلف فرموں میں درخواستیں روانہ کرتا اور انٹرویو دیا کرتا۔ بالاخر ایک کمپنی نے اسے منتخب کر ہی لیا۔ پھر وہ جانے کی تیاری میں جٹ گیا دیکھتے ہی دیکھتے اس کا ویزا آ گیا اور ٹکٹ بھی اوکے ہو کر آ گیا، کوئی تین دن بعد اسے ہندوستان چھوڑنا تھا۔ ایک طرف تو ریاض میں ملازمت ملنے کی خوشی تھی اور دوسری جانب والدین بہن اور عزیز واقارب سے بچھڑنے کا احساس الگ تھا، شہینہ سے بچھڑنے کا غم بھی تھا۔ نجانبے واپسی کب ہوگی اور مستقبل کے حالات پتہ نہیں اس کے اپنے لئے بہتر ہونگے یا پھر اس کے مخالف۔ دوسو سو کے ہزاروں ناگ پھن پھیلانے اُسے ڈسنے کو تیار تھے، اپنے باہر جانے کے پروگرام سے مطلع کرنے کے لئے اور اپنے ماموں مومانی سے ملنے کے لئے جب وہ ان کے عالیشان کوٹھی نمائنگے میں داخل ہوا تو اس کے ماموں قدا حسین کہیں جانے کیلئے جیسے تیار کھڑے تھے، جیسے ہی کامران اندر داخل ہوا ان کی نظر ان پر پڑی تو اس نے انھیں بڑے ہی ادب سے سلام کیا جواب میں انہوں نے اسے دعائیں دیں پھر اپنی بیگم اور بیٹی کو آواز دینے لگے ”سلمیٰ“ شہینہ دیکھو بھئی کامران میاں آئے ہیں“ قدا حسین صاحب کی آواز پر وہ دونوں ڈائینگ روم میں چلی آئیں، کامران نے ممانی کو سلام کیا انہوں نے بھی جواب میں اسے دعاؤں سے نواز پھر پوچھنے لگیں آپا بیگم طاہر بھائی اور ملیحہ وغیرہ کیسے ہیں؟

اللہ کا فضل ہے امی جان اور ابو دونوں ہی بخیریت ہیں، البتہ ملیحہ کو چند دنوں سے بخار کا سلسلہ چل رہا ہے دراصل میں آپ لوگوں کو مطلع کرنے آیا تھا کہ پرسوں شام میری فلاٹ ہے میں ریاض جا رہا ہوں، وہاں کی ایک تعمیراتی کمپنی میں بحیثیت

سول انجیتر میرا انتخاب ہو چکا ہے، اور پرسوں شام یہاں حیدر آباد سے مجھے لکھا ہے، کامران نے اپنے ملنے آنے کی غرض و غایت سے فدا حسین صاحب اور ان کی بیگم کو آگاہ کیا۔

”بہت مبارک ہو کامران بیٹے، ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ تمہیں ریاض میں ایک معقول ملازمت مل گئی ہے۔ فدا حسین صاحب نے کہا اور آگے بڑھ کر کامران سے بغلگیر ہوئے اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہنے لگے ”طاہر بھائی کو تم سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اللہ کرے کہ ان کے سارے خواب ساری آرزوئیں و تمنائیں تمہاری وساطت سے پوری ہوں یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ تمہیں ایک اچھے پوسٹ پر منتخب کیا گیا ہے۔ میری جانب سے عائشہ خانم اور اپنے ابو سے بہت بہت مبارکباد کہنا، پرسوں شام اگر کوئی خاص مصروفیت نہ رہی تو ملنے ضرور آؤں گا ورنہ سلمیٰ اور شمینہ تو آئیں گے ہی۔ پھر انہوں نے ہاتھ کی گھڑی پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا ”کامران بیٹے مجھے ایک ضروری میٹنگ میں شریک ہونا ہے اب میں چلوں گا خدا حافظ، یہ کہہ کر وہ اپنا بریف کیس تھامے باہر نکل آئے۔

شمینہ تم بیٹھو اور کامران سے باتیں کرو میں ابھی ملازم سے چائے وغیرہ بھجواتی ہوں! سلمیٰ بیگم بھی اندر چلی گئیں تو کامران اور شمینہ دونوں تنہا رہ گئے کامران دو دن بعد چلا جائے گا، یہ سوچ کر شمینہ کے جیسے سارے حواس گم ہو گئے تھے اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ کامران اتنا جلد اس سے جدا ہو جائیگا۔ وہ دونوں علیحدہ مکانوں میں رہتے ضرور تھے، لیکن ان دونوں کے کلچ تقریباً ایک ہی مقام پر تھے اور ہر روز نہ سہی دو تین دن کے وقفے سے انکی ملاقاتیں ضرور ہو جایا کرتی تھیں، لیکن چند دنوں سے کامران اپنی کوششوں میں مصروف تھا تو جیسے شمینہ کو یکسر بھول بیٹھا تھا اور جب اپنے مقصد میں اسے کامیابی ملی تو اس نے اولین فرصت میں شمینہ ہی کو یہ خوشخبری بھی دی کہ اس کا انتخاب ہو چکا ہے اور ریاض کی ایک کنسٹرکشن کمپنی نے اسے بحیثیت سول انجیتر

ملازمت دی ہے۔ اب بس ویزا اور ٹکٹ کا انتظار ہے، لیکن ٹمینہ یہ سوچ کر خاموش رہی تھی کہ اکثر اوقات ویزا اور ٹکٹ وغیرہ کی کاروائیوں میں چار چھ مہینے تو یوں ہی لگ جانے ہیں، اسی خیال کے زیر اثر وہ مطمئن تھی۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ کامران اتنا جلد اس سے جدا ہو جائیگا۔ اس سے جدائی کا تصور ہی اس کے لئے سوبان روح تھا اور جب کہ وہ اس کے سامنے موجود تھا اور کہہ رہا تھا کہ دو دن بعد وہ اس سے جدا ہونے والا ہے تو گویا کسی نے اس کی ساری طاقت سلب کر لی ہو، وہ ایک قدم بھی آگے بڑھنے کی طاقت و سکت خود میں محسوس نہ کر رہی تھی اور ایک ٹک کامران کو یوں تنکے جا رہی تھی جیسے اس کی نگاہیں پتھر اگنی ہوں۔ اس کی غیر ہتوقی ہوئی حالت کو دیکھ کر کامران پریشان ہو گیا، آگے بڑھا اور اسے تھامتے ہوئے صوفہ پر بٹھا دیا اور پوچھا ”ٹمینہ تم ٹھیک تو ہو“

”ایک روح فرسا خبر سنا کر اور میری جان نکال کر پوچھ رہے ہو کہ میں ٹھیک تو ہوں۔ کامران یہ اتنی جلد کیسے ہو گیا۔ میں تو اس لئے مطمئن تھی کہ چلو ابھی کچھ مہینے تم یہیں رہو گے۔ ٹمینہ نے مری ہوئی آواز میں کہا، یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی آواز کہیں دور سے آرہی ہو۔“

مجھے خود بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی کیسے ہو گیا لیکن خوش بھی ہوں کہ میری کاوشوں کا ثمر مجھے ملا اور تمہاری دعائیں بھی بار آور ہوئیں۔ اور پھر جتنی جلدی میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں گا اور کچھ قابل بن جاؤں گا تو یہ ہمت کر سکوں گا کہ تمہیں اپنے لئے مانگ سکوں!

ہاں ٹھیک ہے لیکن میں کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی ہوں۔ ابھی مجھے گریجویشن مکمل کرنے میں یوں بھی ایک سال باقی ہے، تب تک تو تم بھی کچھ بن جاؤ گے پھر دیکھنا کہ می پاپا کیسے انکار کرتے ہیں۔ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا تو کامران مطمئن ہو گیا، ملازم چائے کے ساتھ کچھ لوازمات بھی لے آیا تھا چائے پی کر ٹمینہ کو دو دن بعد اسے وداع کرنے آنی کی تاکید کر کے وہ چلا گیا۔

دو دن پلک جھپکتے ہی جیسے بیت گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پل وہ لمحے آن کھڑے ہوئے جب کامران سب سے جدا ہو کر جانے والا تھا۔ سلی بیگم اور ثمنہ دونوں صبح ہی سے طاہر صاحب کے گھر پہنچ گئے تھے تاکہ عائشہ خانم کی دل جمعی کی جاسکے۔ کامران اپنا بیگ پہلے ہی سے تیار کر چکا تھا، پھر ملنے آنے والوں کا جیسے تانتا سا بندھ گیا تھا۔ اس کے اپنے دوستوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا، قریبی دوست جن کے گھروں میں وہ بحیثیت ایک فرد کے جایا کرتا تھا انکی مائیں اور بہنیں بھی اسے وداع کرنے آئی ہوتی تھیں۔ پھر اس کے ابو طاہر حسین صاحب کے ملنے والوں نے بھی جیسے قطار باندھ رکھی تھی کامران کو گھر سے سات بجے ہی نکلتا تھا، کامران موقع کی تاک میں تھا کہ ثمنہ سے تنہائی میں کچھ دیر بات کر لے لیکن ایسی کوئی صورت نظر نہ آرہی تھی مجبوراً اسے اپنی چھوٹی بہن ملیحہ سے کھنا پڑا۔ دیکھو ملیحہ کسی طرح ثمنہ کو بلا لائی اس سے علمیگی میں کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔!

ایسی کیا خاص بات ہے بھائی جان جو آپ ہم سب کے سامنے نہیں کہہ سکتے۔ ملیحہ نے معنی خیز مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجا کر اور بہنوں والی اکڑ کے ساتھ کہا تو کامران نے اسکی دراز چوٹی تھام لی اور ایک ہلکا سا جھٹکا دے کر کہا ”زیادہ ترخے نہ دکھاؤ ورنہ تم اپنی یہ گز بھر لابی چوٹی سے ہاتھ دھو بیٹھو گی!“

اچھا بابا بلا لاتی ہوں آپ کی ملکہ عالیہ کو پہلے میری چوٹی تو چھوڑیں! ملیحہ نے لپکتے ہوئے کہا اور ثمنہ کو بلانے چلی گئی، چند لمحوں بعد ثمنہ اسکے سامنے موجود تھی کامران نے بغیر وقت ضائع کئے اپنی جیب سے گلاب کا ایک تازہ پھول نکالا اور ثمنہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہنے لگا! دیکھو جان یہ پھول میں تمہیں اپنی محبت کی یادگار کے طور پر پیش کر رہا ہوں، خدا را اسے کبھی ضائع نہ کرنا، بڑی احتیاط سے سنبھالے رکھنا، جب بھی تم یہ پھول دیکھو گی یہ تمہیں میری یاد دلائے گا۔ میری چاہت، میری محبت کی یاد تمہارے دل میں تازہ ہو جائیگی۔! اٹھا بھتے ہوئے اس کے لب کانپ اٹھے ثمنہ کیلئے

اس کی چاہت اس کی محبت، اس کی تمنا کامران سے جدا ہونے کا تصور ہی اس کیلئے جان لیوا ثابت ہو رہا تھا کامران کہہ رہا تھا، اگر ہم خدا نخواستہ نہ مل سکیں، ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو یہ پھول ہماری محبت کی یادگار بن جائیگا! ”کامران خدا را ایسا نہ کہیئے آپ سے جدا ہو کر آپ سے بچھڑ کر میں زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں آپکا انتظار قیامت تک کر سکتی ہوں ہو سکے تو جلد لوٹ آنا۔ اس سے قبل کہ زمانہ مجھ کو آپ سے چھین لے! ثمنہ نے اس کے پیار کے تحفہ کو پہلے اپنے ہونٹوں سے چوما اور اپنی آنکھوں سے لگا کر دل کے قریب محفوظ کر لیا۔ پھر خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلی آئی، کامران اسی رات ریاض کیلئے پرواز کر گیا۔

وقت کا پیچھی پر پھیلے پرواز کرتا رہا۔ کامران کو گئے ایک سال ہو گیا تھا، اس درمیان اس کی بہن سلیمہ کی شادی ہو چکی تھی چھٹی نہ ملنے کے باعث وہ اپنی عزیز ترین بہن کی شادی میں بھی شریک نہ ہو سکا تھا ادھر ثمنہ نے سائنس میں گریجویشن مکمل کر لیا تھا اور گھر بیٹھ گئی تھی، اس کے پاپا فدا حسین کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، اس کے پاپا کے دوستوں کے لڑکوں کے رشتے اس کیلئے آنے شروع ہو گئے تھے، فدا حسین صاحب ہر رشتہ کی جانچ پڑتال خود ہی کرتے گھر میں کسی کو کچھ خبر نہ تھی، نہ ہی سلمی بیگم کو کچھ پتہ تھا اور نہ ہی اس قسم کی بازگشت کی صدا ثمنہ کے کانوں تک پہنچتی، فدا حسین ہر بات بہت پوشیدہ رکھتے، اپنی بیگم تک کو معلوم نہ ہونے دیتے، انکا اپنا نظریہ یہ تھا کہ جب کوئی معقول رشتہ آئے جس سے وہ خود مطمئن ہوں گے تب ہی وہ اس کی تشہیر کرینگے چنانچہ بڑی چھان بین کے بعد انہیں اپنے ایک دوست کے بھانجے کا رشتہ پسند آ گیا۔ لڑکا ڈاکٹر تھا اور پینڈم بھی تھا۔ خاندانی پس منظر سے بھی وہ مطمئن ہو گئے تھے۔ پھر انہوں نے ساری باتیں خود ہی طے کر لیں تب کہیں اپنی رفیق حیات سلمی بیگم کو اس کی بابت تفصیلات سے آگاہ کیا، اور کہا کہ ثمنہ سے بھی اس رشتہ کی بات کہہ دیں، یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا یا پھر ثمنہ اور کامران کی بد قسمتی کہ جس دن فدا حسین اپنے

دوست کے بھانجے سے ثمنینہ کے رشتہ کی بات پکی کر آئے تھے اسی شام انکی بہن عائشہ خانم اور بہنوئی طاہر صاحب انکے گھر تشریف لائے اور ثمنینہ کا ہاتھ کامران کیلئے مانگا خدا حسین صاحب تذبذب میں پڑ گئے بالاخر انہوں نے تحمل سے کام لیتے ہوئے بڑے ہی نرم لہجے میں ساری تفصیلات اپنی بہن سے کہہ دیں اور معذرت خواہ لہجے میں کہا دیکھو عائشہ تم نے تھوڑی دیر کر دی میں ثمنینہ کے رشتہ کی بات پکی کر چکا ہوں اور اب میں اپنے وعدہ سے مکر نہیں سکتا۔ اس سلسلے میں مجھے معاف کر دیں تو میں تمہارا ممنون رہوں گا!

بھائی کی زبان سے انکار سن کر بہن نے دکھی دل اور نمناک آنکھوں سے بھائی کی جانب دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا؟ پھر ناکام اپنے گھر لوٹ گئیں۔ چونکہ سلمیٰ بیگم بھی اپنوں میں ثمنینہ کا رشتہ کرنے کے حق میں نہیں تھیں اس لئے اس لئے خاموش ہو رہیں۔ اس طرح ثمنینہ کی تقدیر کسی دوسرے کے ہاتھوں میں سوئپ دی گئی وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکی اور خاموشی سے زہر جدائی پی گئی ماں باپ کی خواہش کے احترام میں اپنی محبت اپنی تمناد آرزوؤں کی قربانی دے کر وہ چپ چاپ ایک اجنبی کی ہمسفر بن گئی اور بابل کا گھر چھوڑے سسرال چلی گئی۔

ڈاکٹر شاہد کا شمار اپنے فن کے ماہرین میں ہوتا تھا وہ انتہائی ہمدرد اور نیک سیرت انسان تھے غریبوں کے ہمدرد اور مسیحا ثمنینہ کا ہر طرح سے خیال رکھتے، انہوں نے اسے بھرپور محبت دی تھی ثمنینہ کامران کو بھلا کر شاہد کیلئے ایک مکمل شریک حیات کا رول ادا کرنے لگی ان کی ہر خواہش کا احترام کرتی اور یہ کوشش کرتی کہ انہیں اس سے کسی قسم کی شکایت نہ رہے، ان کا ہر کام وہ خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی شاہد بھی اپنی قسمت پر نازاں رہتے کہ ایک خوبصورت اور خوب سیرت شریک حیات اللہ نے انہیں عطا کی تھی، بزرگان دین کا قول واقعی کتنا سچ تھا کہ نیک بیوی دنیا میں مرد کے لئے جنت سے کم نہیں ڈاکٹر شاہد کو یہ قول جب یاد آتا تو وہ سوچتے کہ واقعی ثمنینہ کے روپ میں انہوں نے دنیا ہی میں جنت پالی ہے، بہت ہی مختصر لکھنا تھا ان کا ماں باپ

چھوٹی شادی شدہ بہن شاکرہ اور وہ خود تین افراد پر مشتمل تھا ان کا خاندان ان کے والد گزر چکے تھے شیمہ بہت ہی پرسکون اور پرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہر طرح کا آرام و آسائش میسر تھا۔ رہنے کے لئے خوشنما مکان آمد و رفت کے لئے کار اور ڈاکٹر شاہد کا اپنا ذاتی نرسنگ ہوم بھی تھا جہاں مریضوں کا تانتا سا بندھا رہتا تھا۔ شیمہ مطمئن زندگی گزار رہی تھی، شادی کے تین برسوں میں ہی اللہ نے اس کے چمن زندگی میں دو پھول کھلائے پہلا پھول ثمرین کی شکل میں کھلا اور دوسرا ایاز کی شکل میں وہ جب تخلیق کے درد سے گزری تو خود کو ایک مکمل عورت سمجھنے لگی، ثمرین کی پیدائش سے اس کی زندگی میں گویا جیسے بہار آگئی تھی وہ باپ کی لاڈلی تھی تو دادی اور پھوپھی کی چہیتی بھی وہ اس پر اپنی جان نچا کر تیں۔ پھر دو سال بعد اللہ نے ایاز کے روپ میں اسے ایک بیٹے کی ماں بھی بنا دیا تو خدا کے اس انعام پر وہ سجدہ شکر بجالائی۔!

یہ نظام قدرت بھی عجیب ہے، جس طرح پرسکون اور فرحت بخش چھاؤں کے بعد چلچلاتی دھوپ نکلتی ہے اور بہاروں کے بعد موسم خزاں آجاتا ہے اسی طرح شیمہ کی زندگی بھی اچانک ہی بہاروں کے بعد خزاؤں کے حوالے ہو گئی، اس کی کشتی حیات اچانک ہی منجھار میں آ پھنسی، ڈاکٹر شاہد جو کہ سینکڑوں مریضوں کے مسیحا ثابت ہوئے تھے اچانک ہی اس جہان فانی سے کوچ کر گئے گھر سے اسپتال جانے کیلئے نکلے تھے لیکن راستے ہی میں ان کی کار کو ایک ٹرک نے روند ڈالا اور وہ مقام حاشہ پر ہی جاں بحق ہو گئے۔ اس اندوہناک اور دلدور خبر کو جس نے بھی سنا کف افسوس مل کر رہ گیا شاہد کی والدہ جو کہ ایک ضعیف اور عمر رسیدہ خاتون تھیں اور دل کے عارضہ میں مبتلا تھیں اپنے نعت جگر کی اس بے وقت موت کی خبر سن کر تاب نہ لاسکیں انکا کمزور دل دھڑکن کھو بیٹھا، ایک وقت میں دو دو جنازے جب ایک ہی گھر سے نکلے تو جس کسی نے دیکھا اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں، اچانک ہی شیمہ اور اس کی تہ شاہد پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، شیمہ کے لئے دوہرا غم تھا، ایک تو چاہنے والا شوہر ساتھ چھوڑ بیٹھا تھا تو

دوسری طرف ماں جیسی شفیق اور چاہنے والی ہستی ساس کے سایے شفقت سے بھی وہ محروم ہو گئی تھی۔ اب وہ دشت تنہائی میں بھٹک رہی تھی، بیوگی کا بے داغ لباس اسکا مقدر بن گیا تھا، اس کی خوبصورت نازک نازک کلتائیاں رنگین اور خوشنما چوڑیوں کی کھٹک سے بے بہرہ اور سوئی ہو گئی تھیں، دو معصوم بچے ہی اب اسکا واحد سہارا تھے یوں تو اس کے والدین کا سایہ اس پر قائم تھا لیکن چونکہ شوہر کی بے شمار یادوں کا سرمایہ اس کے پاس تھا اس لئے اس نے اسی گھر کی چھت کے سایہ تلے رہنا گوارہ کر لیا تھا۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ وقت بڑے سے بڑے زخم کا مرہم ہوتا ہے، جیسے جیسے وقت کی سوئی آگے بڑھتی گئی ثمنینہ کے زخم مندمل تو کیا ہوتے ان کی ٹیسیں کچھ کم ضرور ہونے لگیں، ماں باپ نے جب دلاسا دیا تو وہ کچھ سنبھل گئی، ڈاکٹر شاہد کے نرسنگ ہوم کو دوسرے ڈاکٹروں نے سنبھال لیا تھا اور ایک معقول رقم وہ ثمنینہ کو ادا کرنے لگے تھے۔ وہ سب کچھ بھلا کر اپنے بچوں میں گم ہو کر اپنے سارے غم بھولنے کی سعی کرنے لگی اور ایک حد تک اسے کامیابی بھی ملی۔ اب اسکا روزانہ کا یہی معمول تھا۔ آج جب اچانک ہی اس کی پرانی ڈائری کے پنے اس کے سامنے بکھرنے لگے اور اپنی پہلی محبت کا یادگار تحفہ گلاب کا پھول جو کہ اب سوکھ کر کاغذ کی شکل اختیار کر گیا تھا اس کے سامنے آگرا تو ماضی کا ایک ایک پل، ایک ایک لمحہ اسکی نگاہوں کے سامنے لہراتا چلا گیا۔ اور اسکے دل کے سارے زخم اچانک ہی ہرے ہو کر رہنے لگے، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی سی لگ گئی۔ ماضی سے جب وہ حال میں لوٹی تو گھڑی کی سوئیوں نے کافی وقت گزرنے کا اسے پتہ دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں خشک کیں اور ہاتھ روم جاکر چہرے پر پانی کی چھینٹیں ماریں اور باورچی خانے میں جا کر بچوں کیلئے دوپہر کے کھانے کے انتظام میں جٹ گئی۔ وہ کچن میں پہنچ کر ابھی دو ایک چیزیں ہی تیار کر پانی تھی کہ کال بیل کی موسیقی ریز آواز قضا میں تحلیل ہوتی گئی، ثمنینہ نیکیں تھامے ہاتھ صاف کرتی ہوئی دروازے تک جا پہنچی، اسنے جب دروازہ کھولا تو غیر یقینی کیفیت سے دوچار ہو گئی۔ وہ

مبسوت سی کھرئی کی کھرئی رہ گئی کیونکہ اس نے جو کچھ دیکھا ایک خواب سے کم نہ تھا۔ برسوں بعد جب کوئی اچانک ہی سامنے آجائے تو یقیناً غیر یقینی کیفیت سے ہر کوئی دوچار ہو ہی جاتا ہے۔ ثمنہ بھی پریشان ہو گئی کہ یہ اچانک ہی ایک طویل مدت بعد کامران اسکے روبرو کیسے وارد ہو گئے۔ کامران نے جو دیکھا کہ ثمنہ بالکل اپنے ہوش کھو بیٹھی ہے تو انہوں نے دھیرے سے آواز دی ثمنہ کیا مجھے اندر آنے کیلئے بھی نہیں کھوگی۔

ان کی آواز پر وہ چونک پڑی اور شرمندہ سی ایک طرف بیٹے ہوئے کھنے لگی۔ آئیے کامران اندر تشریف لے چلے۔ ! اور اس نے برآمدے تک ان کی رہنمائی کی۔ دالان میں ایک جانب صوف سیٹ رکھا تھا، اس نے کامران کو بٹھایا اور خود ان کے روبرو بیٹھ گئی۔ کامران مجھے اب بھی یقین نہیں ہو رہا کہ آپ میرے سامنے بیٹھے ہیں یہ برسوں لاپتہ رہ کر اب ہم سب کی یاد کیسے آگئی آپ کہاں گھو گئے تھے آپ یکسر ہی بھلا بیٹھے ہم سب کو! ثمنہ نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

ہاں ثمنہ یوں سمجھو کہ میں کہیں گم ہو گیا تھا، مجھے جب خبر ملی کہ تمہاری شادی ڈاکٹر شاہد سے ہو گئی ہے تو مجھے یوں لگا جیسے اس ساری کائنات میں اب میرے لئے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ تم سے جدائی کا جو زخم میرے دل پر لگا تو جیسے ساری کائنات مجھے بے وقعت سی معلوم ہونے لگی۔ جس جسم سے روح نکالی جا چکی ہو وہ جسم بھلا زندہ کیسے کھلائے گا۔ ایک لاش تو کہیں گے اسے میری حالت بھی بس اس جسم جیسی تھی جس سے روح نکالی جا چکی ہو۔ تمہارے بغیر میرے لئے زندگی کا کوئی مفہوم ہی نہ تھا، جب میری چاہت ہی مجھ سے چھن گئی تو اب اس کائنات میں میرے لئے کیا باقی رہ گیا تھا میں نے سارے رشتے بھلا ڈالے سارے رشتوں سے میرا یقین اٹھ چکا تھا۔ چنانچہ میں نے خود کو کمپنی کے کاموں میں گم کر ڈالا۔ تاکہ کوئی یاد باقی نہ رہے، اسی طرح پانچ برس بیت گئے میں اب بھی نہ آتا لیکن جب بلوچ نے مجھے یہ روح فرسا اور دلہوز خبر لکھ بھیجی کہ تمہارے شوہر ڈاکٹر شاہد کار ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے تو یقیناً جانو ثمنہ وہ رات

مجھ پر بہت بھاری گزری۔ ساری رات رہ رہ کر تمہارا غم گین اور اجر اُجڑا سا چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگتا اور میں تڑپ جاتا۔ قدرت بھی نہ جانے کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے ہمارے ساتھ پھر کسی کام میں میرا دل نہ لگا۔ میں چھٹی حاصل کر کے چلا آیا۔ ایک مقصد ایک آرزو ایک تمنائے کہ تمہاری اجر ملی ہوئی زندگی پھر سے آباد کر دوں۔ تمہاری روٹھی ہوئی بہاریں پھر سے لوٹا دوں تمہارے خزاں رسیدہ چمن زندگی میں پھر سے بہار لے آؤں!“

نہیں کامران نہیں یہ سب کچھ اب ممکن نہیں ٹھینہ تقریباً چنچ پڑی۔ اس کی آنکھوں سے پھر آنسوؤں کا آبشار سا بہنے لگا۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ”کامران میں اتنی خود غرض نہیں! آپ کوئی اچھی سی خوبصورت سی لڑکی کو دلن بنا لیجئے میں اپنی زندگی سنوارنے کیلئے آپ کی زندگی داؤ پر لگا دوں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ لوگ کیا کہیں گے، سماج کیا کہے گا، آپ کو شاید پتہ نہیں شاید نے اپنی دو نشانیاں چھوڑی ہیں، ان ہی کے سہارے میں بقیہ زندگی کاٹ لوں گی، آپ کیوں اپنی زندگی کو گھن لگانا چاہتے ہیں؟“ ٹھینہ نے خلوص کے جذبے کے زیر اثر کہا۔ ٹھینہ کیا تم نے میری محبت کو اتنا کم تر جانا ہے کیا تمہارے بچے میرے بچے نہیں ہو سکتے، کیا تم انہیں باپ کے پیار اور شفقت سے محروم کرنا چاہتی ہو نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گا کہ یہ زندگی جب تمہارے کام نہ آسکی تو بھلا میرے کس کام کی کہو ٹھینہ کیا چاہتی ہو، تم اگر مجھے زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو میری بات مان لو اور ہاں کہ دو، میں آج شام کو ہی ماموں جان سے بات کر لوں گا۔ درنہ پھر تم کل میرے جنازے میں شریک ہوگی! کامران اپنی زندگی قربان کرنے پر تل گیا تھا، اس کے لہجے میں چھپے ہوئے عزم کو دیکھ کر ٹھینہ لرز گئی اور سوچ کے گہرے سمندر میں ڈوبنے لگی۔ مدتوں قبل اسکی محبت کی چنگاری کو اس نے ڈھیروں راکھ تلے دبائے رکھنے کی سعی کی تھی وہ آج ابھر کر آنے لگی تھی۔ کامران کی ضد کے آگے اس نے خود کو بے بس و مجبور

محسوس کیا، اسے اسکی آرزوؤں اور تمنائوں کی تکمیل کیلئے جھکنا پڑا پھر اس نے دھیرے سے کہا ”کامران اگر تم یہی چاہتے ہو تو تمھاری مرضی، کیوں کہ میں تمہیں ایک بار کھو کر اتنا پچھتائی ہوں کہ اب دوبارہ کھونے کی مجھ میں نہ ہمت ہے اور نہ حوصلہ۔ اور اگر اللہ کی یہی مرضی ہے تو میری بھی یہی!“ اس نے کہہ کر تو دیا لیکن وہ کامران سے نظریں نہ ملا سکی۔

بہت بہت شکریہ ٹہینے تم نے میری محبت کی لاج رکھ لی، اسے مجروح ہونے سے بچالیا تم نے مجھے نئی زندگی عطا کر دی، فرط محبت سے کامران نے اٹھ کر اسے خود سے بہت قریب کر لیا اور دھیرے سے کہا ”محترمہ ہم نے یوں ہی نہیں چاہا تم کو۔! کامران نے اس کے چوڑیوں سے خالی سونے سونے ہاتھ تھام کر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ ان پر رکھ دیئے اور وہاں سے چلا آیا، وہ جب جانے لگا تو ٹہینے کے دل پر اپنے لئے عظمت کے نشان نقش کر تا گیا قدرت کے اس عجیب و غریب فیصلہ پر ٹہینے کی آنکھیں بھر آئیں اور آنسوؤں کے دو قطرے لڑھک کر اس کے رخسار کا سہارا لے کر اسکی ساڑی کے آنچل میں جذب ہو گئے، یہ آنسو خوشی کے تھے یا کسی کی عظمت کردار پر بہہ نکلے تھے وہ انہیں کوئی عنوان نہ دے سکی۔!

سے ان کے اپنے وجود معطر ہونے لگے لیکن ساتھ ہی خرچ کا دائرہ بھی پھیلنے لگا۔ طائر وقت نے جب اپنے پر پھیلانے اور افق زندگی میں دور تک اڑنے لگا تو اللہ رب العزت نے انہیں اوصاف کی شکل میں ایک گول مٹول اور خوبصورت سا بیٹا عطا کیا۔ اس پھول نے ان کے گلشن حیات کو رونق بخشی، ننھے اوصاف کی کلکار یوں سے ان کا چھوٹا سا آشیانہ گونجنے لگا۔ وہ دونوں اپنے انمول پیار کے ان موتیوں کو قدرت کے پیش بہا انعام سے تعمیر کرتے اور ان کے ننھے وجود کو اپنے سینے سے چپٹا کر راحت محسوس کرتے !

جب آہستہ آہستہ زندگی کی ضرورتیں اپنا دامن پھیلانے لگیں تو کاشف یہ سوچنے پر مجبور ہونے لگے کہ یہاں ہندوستان میں رہ کر جتنا کمایا جاسکتا ہے وہ محض چھوٹی موٹی ضرورتوں کی تکمیل کی حد تک کافی ہو سکتا ہے اور پھر جب وہ اپنے آس پاس نظر ڈالتے تو انہیں یوں لگتا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں رہ رہے ہیں کیونکہ وہ دیکھتے کہ معمولی تعلیم حاصل کر کے جو لوگ خلیجی ممالک میں ملازم ہیں وہ غیر معمولی کما رہے ہیں، جبکہ وہ ایک قابل ترین ڈگری ہولڈر تھے تب انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود بھی خلیجی ملک جائیں گے، پھر انہوں نے اپنی شریک حیات ثمرین سے اپنے اس پروگرام کے متعلق بات کی۔

ثمرین نے جب سنا تو قدرے پریشان ہو گئی اور کہا ”آپ یہاں جو کچھ کما رہے ہیں وہ ہماری ضرورتوں کی تکمیل کیلئے کافی ہے، اللہ تعالیٰ نے جب ہمیں ہر خوشی دی ہے تو صرف دولت کے حصول کیلئے ان نعمتوں سے ناشکری کیوں کی جائے؟“

نہیں ثمرین تم مجھے غلط مت سمجھو میں اللہ کی عطا کردہ نعمتوں سے مکر نہیں رہا اسی کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے کہ ہم آج اتنی خوشحال زندگی گزار رہے ہیں لیکن ذرا سوچو کہ میرے کندھوں پر دو چھوٹی بہنوں فرحین اور زرین کی شادیوں کی ذمہ داری بھی ابو چھوڑ گئے ہیں۔ اسے بھی ہمیں نبھانا ہے، اور پھر کل کو جب شانوار اوصاف بڑے ہوں گے تو ان کی تعلیم کا خرچ اور دوسری ضرورتوں کی تکمیل کیا ہم اس معمولی آمدنی سے پورا کر پائیں گے۔ اور پھر ہمیں اپنے خوابوں کا گھروندہ بھی بنانا ہے، ایک چھوٹا سا سی



وہ آج بے انتہا خوش تھی، خوشی کا احساس اس کے خوبصورت وجود میں کچھ اس طرح سرچ بس گیا تھا کہ اس کی ایک ایک حرکت سے خوشی چھلکتی جا رہی تھی، اس کی ممی والدہ اور امی جان (ساس) دونوں ہی اسے اس کیفیت میں دیکھ کر زیر لب تبسم تھے ان کی تجربہ کار نگاہیں اس کے وجود سے چھلکتی جا رہی خوشی کو محسوس کر رہی تھیں اور ان کے اپنے وجود بھی طمانیت سے سرشار ہوتے جا رہے تھے، انھیں پتہ تھا کہ ثمرین آج خوشیوں کے بحر پیکر میں کیوں ڈوبی جا رہی تھی، ایک طویل عرصہ کی جدائی کے بعد آج ان کا بیٹا اور ثمرین کا شوہر کاشف ریاض (سعودی عرب) سے چھٹیوں میں اپنے وطن حیدر آباد لوٹ رہا تھا، ایک جانب اس کے دونوں بچے شانوا اور اوصاف بھی خوشی خوشی کھیل میں مگن تھے۔

کاشف اور ثمرین کی شادی ہوئے تقریباً آٹھ سال ہو رہے تھے، کاشف نے شروع میں سائنس میں ڈگری حاصل کی تھی اور بعد میں کمپیوٹر انجینئرنگ میں بھی ڈگری لی تھی، حیدر آباد ہی میں ایک کمپنی میں ملازم تھا تنخواہ معقول تھی لیکن پھر بھی آجکل خواہشوں کے حصار میں قید اور مسابقتی دوڑ میں گھری زندگی کیلئے کسی قدر ناکافی تھی۔ پھر جوں جوں وقت کی سوئی آگے بڑھتی رہی ان کی اپنی ضرورتوں اور حقوق العباد کی تکمیل کاشف کیلئے قدرے ذہنی بوجھ کی شکل اختیار کرتی گئی، کیونکہ کاشف کے کندھوں پر بیوہ ماں اور چھوٹی دو بہنوں کی ذمہ داری بھی اس کے ابو چھوڑ گئے تھے، پھر ان کے صحن زندگی میں جب شانوا کی شکل میں ایک کلی کھلی تو اس کی بھینی بھینی پیار بھری مہک

خوبصورت مکان جس کی بالکنی میں بیٹھ کر ہم سورج کے ڈوبنے کا دلفریب منظر دیکھا کریں گے، جس میں ہمارے بچوں کے قہقہے گونجا کریں گے، اس کے کشادہ صحن میں خوبصورت کیاریاں بنی ہوں گی جن میں خوبصورت رنگ برنگے پھول کھلیں گے اور سارے گھر کو اپنی خوشبو سے معطر کرینگے کیا تم نہیں چاہو گی کہ ہمارے یہ خواب پورے ہوں ہمیں ان خوابوں کی سچی تعبیر ملے، ہمارا اپنا اک چھوٹا سا آشیاں بنے اور ہماری آرزوؤں و تمناؤں کی تکمیل ہو۔! کاشف نے ثمرین کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

ہاں کاشف یہ تو ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ ایک چھوٹا سا ہی سہی اس کا اپنا الگ آشیاں ہو میں بھی چاہتی ہوں کہ ہمارا بھی ایک خوبصورت گھر بنے اور ہمارا یہ گھر خوشیوں کا گہوارہ ہو، جہاں خلوص و محبت کی مکھ ہو۔ اور میں اسے نمونہ جنت بناؤں گی، اللہ رب العزت کا بڑا کرم ہے کہ ہمارے ہاں کوئی مسائل نہیں ہیں۔ لیکن صرف آپ سے جدائی کا تصور ہی میرے لئے سوہان روح بنتا جا رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ طویل عرصہ میرے لئے کھیں قیامت نہ ثابت ہو۔! ثمرین نے کہا۔

نہیں ثمرین تم اتنی پست ہمت نہ بنو، یہ تو قدرت کا بنایا ہوا اصول ہے کہ انسان کو اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لئے ظاہر ہے کہ قربانی دینی ہی پڑتی ہے ہمیں بھی ایک دوسرے سے دوری اور جدائی کا یہ زہر پینا ہو گا۔ اور اگر انسان کا حوصلہ بلند ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔ تم بھی اپنا حوصلہ بلند رکھو بہت جلد ہماری جدائی کے یہ دن ختم ہو جائیں گے، کاشف نے جب ثمرین کی ہمت بندھائی تو اس نے انھیں خلیجی ملک جانے کیلئے اجازت دے دی۔

کاشف ایک قابل شخص تھے، ان کی کوششیں بہت جلد کامیاب ہو گئیں، انھیں ریاض میں ایک امریکی کمپنی میں ملازمت مل گئی، تنخواہ بھی معقول تھی، دیکھتے ہی دیکھتے سارے کام ہو گئے اور وہ اپنے افراد خاندان سے بچھڑ کر ریاض (سعودی عرب) کیلئے پرواز کر گئے وہاں پہنچ کر بہت جلد انھوں نے اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا۔ ان کی کمپنی کے

اعلیٰ افسر انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کی قابلیت کی بنیاد پر انھیں قابل احترام سمجھتے تھے، انھوں نے بہت جلد اپنی کمپنی میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیا، انکی تنخواہ میں بھی قابل قدر اضافہ کیا گیا۔

ادھر ثمرین تنہا ہو گئی تھی، گھر کی ساری ذمہ داری اس کے نازک کندھوں پر آن پڑی تھی گھریلو ضروریات کی تکمیل کیلئے اسے مجبوراً گھر سے باہر نکلنا پڑتا، بچوں کے اسکول جانا ہوتا، ان کی تعلیم پر خاص توجہ دینی پڑتی، فرحین اور زرین کی ضرورتوں کا خیال رکھنا پڑتا اور پھر امی جان کی صحت کیلئے بھی اسے سوچنا پڑتا یوں تو ضعیفی خود ایک مرض ہوتا ہے اس پر دوسرے کئی امراض نے انھیں گھیر رکھا تھا، دواخانوں کے چکر بھی اسے کھٹے پڑتے، ان سب امور کی تکمیل میں وہ تھک کر چور ہو جاتی، رات جب بستر پر لیٹی تو نیند کی دیوی اس قدر مہربان ہوتی کہ پتہ ہی نہ چلتا، دوسرے دن پھر وہ اپنے روزانہ کے معمولات میں مشغول ہو جاتی کاشف سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی چلتا رہا، گھر کے حالات پر سکون اور اطمینان بخش چل رہے تھے تو کاشف بھی مطمئن تھے اپنی ساری توجہ کمپنی کے کاموں پر مرکوز رکھتے۔

کاشف دو سال بعد جب چھٹی پر وطن لوٹے تو اپنی دونوں بہنوں فرحین اور زرین کی شادیوں کا پروگرام ان کے ساتھ تھا، ادھر ثمرین اور امی جان کی کاوشوں کے نتیجے میں دونوں کے رشتے مناسب خاندان میں طے پا گئے تھے۔ ثمرین نے بہت بھاگ دوڑ کی تھی اور ساری تیاری تقریباً مکمل ہی تھی۔ کاشف کو زیادہ پریشان نہ ہونا پڑا اور اللہ کے فضل و کرم سے شادی کی تقریب پر اثر انداز میں انجام پائی، دونوں دولہے ایک ہی مسند پر رونق افروز ہوئے اور دونوں کا خطبہ نکاح ایک ساتھ پڑھا گیا، مہمانوں کی کثیر تعداد نے جن میں عزیز واقارب کے علاوہ معززین شہر بھی شامل تھے، اس مقدس محفل کو رونق بخشی اور نکاح کی یہ مقدس محفل شاندار طریقے پر اختتام کو پہنچی۔

کاشف اور ثمرین بہت خوش تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قربانیوں کو قبول کیا اور

ان کے کندھوں سے بہنوں کی ذمہ داری کا بوجھ بہت خوش اسلوبی سے ہٹ پایا۔ امی جان بھی بہت خوش تھیں اور بیٹے بہو کی تعریف کرتے کرتے ان کی زبان خشک ہونے لگی تھی اور اپنے ملنے جلنے والیوں کے سامنے انھیں بے شمار دعاؤں سے نوازی تھی۔

شادی کی مصروفیات جب اختتام کو پہنچیں تو کاشف نے ثمرین سے کہا ”میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم ایک مناسب سا پلاٹ خرید لیں۔ تاکہ آئندہ چھٹیوں میں جب میں آؤں تو کسی معقول انجینئر کے ذریعہ اپنا من پسند مکان بنا سکوں، تمہارا کیا خیال ہے، کیا علیحدہ مکان پسند کرو گی یا کسی کامپلکس میں فلیٹ؟“

فلیٹ کی زندگی مجھے قطعی پسند نہیں۔ اس میں نہ زمین اپنی ہوتی ہے اور نہ چھت میں تو یہی چاہتی ہوں کہ ہم مختصر سا ہی سی مکان ہی بنالیں تین سو گز رقبہ والا پلاٹ کسی اچھے اور ہوادار مقام پر خرید لیں گے۔ اور پھر آپ کی جب اور جیسی گنجائش ہو تعمیری کام شروع کیا جاسکتا ہے! ثمرین نے اپنا نظریہ بیان کیا۔

”ہاں ثمرین، بہت مناسب خیال ہے تمہارا مجھے خوشی ہے کہ تم نے بھی میرے ہی خیالات کی ترجمانی کی ہے میں چاہتا ہوں کہ امی جان سے بھی اس مسئلہ پر بات کر لوں، ان ہی کی دعاؤں کے طفیل ہم اپنے اس خواب کی تعبیر انشاء اللہ ضرور پائیں گے۔“ کاشف مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

بے شک، ان کے علاوہ ہمارے لئے بزرگ ہستی اور ہے بھی کون، ان ہی کے مشورے پر آپ عمل کیجئے گا، ثمرین نے جب کھلے دل سے کہا تو کاشف کو اس کی اعلیٰ ظرفی پر بے انتہا پیار آ گیا۔ وہ اسے محبت پاش اور میٹھی لگاہوں سے تکیے لگے۔ انھیں اس طرح گھورتا ہوا دیکھ کر ثمرین نے پوچھا ”آپ اس طرح یوں تکیہ لگاہوں سے کیوں دیکھ رہے ہیں کیا میں نے کچھ غلط کہا؟“

”ارے بھئی یہ تکیہ نہیں میٹھی لگاہیں ہیں میں اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر گزار

ہوں کہ اس نے مجھے تم جیسی اعلیٰ ظرف اور خوبصورت شریک حیات عطا کی ہے ۔
نجانے یہ میرے کس نیک عمل کا انعام ہے جو اس نے جیتے جی تمہاری شکل میں عطا
کر دیا ۔ دنیا کے مفکرین کا خیال ہے کہ نیک اور اچھی بیوی مرد کیلئے دنیا ہی میں جنت
ہے تو ثمرین تم میری شریک حیات ہی نہیں میری جنت بھی ہو ! کاشف نے جب اس
پر فدا ہوتے ہوئے کہا تو وہ بے اختیار شرما گئی اور کاشف کو تنگ کرنے کیلئے کہا ۔

”اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مرد اپنی بیوی سے کوئی خاص کام لینا چاہتا ہو
تو اسی طرح مسکد پالش کرتا ہے “

”کیا تم مجھے بھی ان مردوں میں شمار کرتی ہو ! کاشف جب بید سجیدہ لہجے میں
پوچھ بیٹھے تو وہ سٹپٹا گئی اور ان کی خفگی کو دور کرنے کی غرض سے کہا ۔

”میں نے تو ایک عام سی بات کہی تھی ، آپ یوں خواہ مخواہ ناراض نہ ہوں !
”ٹھیک ہے میری جنت ! انھوں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپٹ لگائی اور
مسکراتے ہوئے باہر چلے گئے تو وہ بھی کام میں جٹ گئی ۔

چند ہی دنوں کی بھاگ دوڑ کے بعد کاشف ایک پلاٹ خریدنے میں کامیاب
ہو گئے ، شہر کے انتہائی پر فضا اور مہنگے مقام پر انھیں ڈھائی سو گز زمین مل ہی گئی ۔ زمین
کی خریداری کی ضروری کاروائی انھوں نے مکمل کر لی اور پھر اپنی موجودگی میں اس پلاٹ
کی حد بندی بھی کروادی ساتھ ہی ایک مشہور آرکیٹیکٹ و انجینئر کو مکان کی پلاننگ کا کام
بھی سونپ دیا ۔

چھٹیوں کے اختتام پر جانے سے قبل ایک رات وہ بستر سے اٹھے اور اپنے
سوٹ کیس کی واچ پاکٹ سے کوئی چیز نکلانے لگے ، ثمرین تکیہ کے سہارے لیٹی کسی
اردو ڈائجسٹ کا مطالعہ کر رہی تھی ، وہ بھی مطالعہ ترک کر کے ان کی ایک ایک حرکت کا
بغور جائزہ لینے لگی ، کاشف بڑی احتیاط سے کوئی چیز اس طرح نکال رہے تھے کہ وہ چاہتے

ہوئے بھی دیکھ نہ سکی، پھر وہ اس کے قریب چلے آئے اور حکم دیا "اپنی آنکھیں بند کرو اور دونوں ہاتھ میری جانب بڑھا دو۔"

ثمرین نے کسی فرماں بردار طالب علم کی طرح ان کے حکم کی تعمیل کی۔ تب کاشف نے سونے کے دو خوبصورت کنگن اس کے خوبصورت حنائی ہاتھوں میں پہنادیے اور پیار سے اپنی مہر محبت اس کے ہاتھوں پر ثبت کرتے ہوئے کہا "ثمرین یہ رہا تمہارا تحفہ اور انعام بھی تم نے جس جتجو اور لگن سے میری ذمہ داریوں کی تکمیل میں میرا ساتھ دیا اور اپنے فرض کو بخوبی نبھایا اور بے انتہا خوش دلی اور خوش اسلوبی کا ثبوت دیا ہے اس کے لئے ایک حقیر سا تحفہ پیش ہے! کاشف جذباتی لمحے میں کہنے لگے تو ثمرین اپنی آنکھیں کھول کر انھیں تنکے لگی۔ کچھ لمحے توقف کے بعد اس نے کہا "کاشف آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں، کیا آپ کی بہنوں سے میرا کوئی رشتہ نہیں، کیا وہ میری بہنیں نہیں ہیں میں نے جو کچھ کیا وہ میرا بھی فرض تھا، جو کہ میں نے نبھایا اور بس! پھر اپنے ہاتھوں میں خوبصورت کنگن دیکھ کر خوشی سے کہنے لگی "کاشف اس تحفہ اور انعام کا بہت بہت شکریہ، آپ مجھے ہر حال میں اپنی شریک پائیں گے، آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ عورت جب کسی کی بیوی بنتی ہے تو اسے شریک حیات کہا جاتا ہے یعنی شوہر کی تاحیات اس کے دکھ سکھ کی شریک اس کی ہر ذمہ داری کی تکمیل کی شریک، اگر کوئی عورت اس امر میں کامیاب نہیں اترتی ہو تو میں کہوں گی کہ اسے شریک حیات کہلانے کا کوئی حق نہیں۔"

ثمرین کے خیالات جان کر کاشف اتنے خوش ہوئے کہ خود پر قابو نہ رکھ پائے اور اسے اپنی باہوں میں بھر کر کہا "اللہ تعالیٰ ہر شخص کو تم جیسی شریک حیات عطا کرے" آمین ثمرہ آمین۔

چھٹیاں جب ختم ہوئیں تو کاشف ریاض کیلئے پھر پرواز کر گئے پھر ثمرین کے پاس صرف انکی یادوں کا سرمایہ رہ گیا، چند دن بڑی اکتاہٹ میں گزرے پھر آہستہ

آہستہ وہ روزمرہ کے کاموں میں اپنی توجہ کاشف کی یادوں سے ہٹانے میں کسی طرح کامیاب ہو گئی، اس طرح دو سال کا پھر ایک طویل عرصہ اسے تنہائی کے زہر کو پی کر گزارنا پڑا۔

وقت بھی کہیں رکا ہے، طائر وقت پرواز کرتا گیا اور مہینوں کی مدت طے کر ڈالی۔ اس وقفے میں بہاریں آئیں اور گتیں، پت جھڑ آئے موسم بدلے رتیں بدلیں اور دو سال کا یہ طویل عرصہ بیت گیا اور آج کاشف پھر چھٹیوں میں اپنے بہت سے پروگرام لیئے وطن لوٹ رہے تھے، ان پروگراموں میں سب سے اہم پروگرام تھا کاشف اور ثمرین کی پسند اور خوابوں کے گھروندے کی تعمیر کا۔

ثمرین اور بچے ایک جانب بے انتہا خوش تھے تو دوسری جانب کاشف کی بہنیں فرحین اور زردین بھی اپنے اپنے شوہر کے ساتھ بھائی کے استقبال کیلئے آپہنچی تھیں، سب لوگ تیار ہو کر ایرپورٹ پہنچے اور جدہ سے راست آنے والی فلائٹ کا انتظار کرنے لگے، انتظار کی طویل اور کٹھن گھڑیاں ختم ہوئیں۔

اور مائیک پر اعلان ہونے لگا۔

خواتین و حضرات، آپ سب کی انتظار کی گھڑیاں اب ختم ہو رہی ہیں، جدہ سے آنے والی فلائٹ ابھی چند لمحوں میں لینڈ کرے گی، چند ہی لمحوں بعد واقعی جہاز زمین چھونے لگا اور پھر مسافر ایک ایک کر کے سیڑھیاں اترنے لگے جن منتظرین کے متعلقہ افراد جہاز سے اتر رہے تھے وہ لوگ خوشی سے آوازیں بلند کر رہے تھے کوئی اپنا ہاتھ لہرا رہا تھا تو کوئی اپنا رومال۔ ایک ایک کر کے تمام مسافر جہاز سے اتر گئے لیکن کاشف کا کہیں پتہ نہ تھا، ہر کوئی مضطرب نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہا تھا،

ثمرین کی نگاہیں بے تابی اور اضطراب کا مظہر تھیں اور ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں اس کا ذہن لمحوں میں بے شمار وسوسوں کی آماجگاہ بن چکا تھا، فرحین اور زرین بھی بے چین تھیں اور پریشان ہو کر اپنے اپنے شوہر کو سوالیہ نگاہوں سے تیک رہی تھیں۔ ان سب پر قیامت خیز اضطراب نازل تھا کہ کاشف آخر آئے کیوں نہیں۔ اور اب کیا کرنا چاہئے وہ سب ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کیا جائے کہ ماتک پر ایک نسوانی آواز گونج اٹھی۔

خواتین و حضرات ہمیں یہ اطلاع دیتے ہوئے بے حد افسوس درنچ ہو رہا ہے کہ جدہ سے آئی ہوئی فلائٹ میں ہمارے ایک معزز مسافر جو کہ ریاض سے حیدرآباد کیلئے سفر کر رہے تھے حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہو گیا، باوجود کوشش کے انھیں بچایا نہ جاسکا۔ ان کا نام ہے جناب کاشف احمد صدیقی ! یہ اعلان سنتے ہی ثمرین کی چیخ نکل گئی "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، کاشف مجھے تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتے ! پھر وہ وزیٹس لاؤنچ کے پکے فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

اس کے بعد کیا ہوا اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا، اسے جب ہوش آیا تو اس وقت جب کاشف کا جنازہ تیار تھا اور وہ اپنے آخری سفر کیلئے تیار تھے، عزیز واقارب دوست و احباب ہر ایک کی آنکھیں کاشف کی جواں سال موت پر اشکبار تھیں، آسمان بھی گویا سو گوار تھا اور ایک عجیب سی اداسی سارے ماحول پر طاری تھی اور ادھر ثمرین کی دنیا ہی لٹ چکی تھی، اس کے نازک وجود پر اچانک ہی غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے کاشف اسے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تنہا چھوڑ کر چلے گئے تھے، اور اس کے سارے ارمان سارے خواب ٹوٹ کر اس طرح بکھرے تھے جس طرح کسی پکے فرش پر ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے ریزہ ریزہ کچی کچی۔



عامر جیسے ہی گھر میں داخل ہوا اسے گھر کی فضا کچھ بو جھل بو جھل اور اداس اداس سی لگی۔ ہر طرف سنٹے کا راج تھا، اسے نہ شاہین نظر آئی اور نہ ماں عائشہ خانم، سیلو بھی کہیں دکھائی نہ دیا، اس نے سب سے پہلے اپنے بیڈ روم کا رخ کیا، کمرہ خالی پڑا تھا، کمرے کی ہر چیز ادھر ادھر بکھری پڑی تھی، اس نے جب الماری کی چھت پر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ سوٹ کیس غائب ہے، تب ساری بات اس کی سمجھ میں آئی، اس نے خود سے مخاطب ہو کر کہا، تو شاہین آخر چلی ہی گئی، اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں، اس نے سوچا، یہ عورت آخر کس خمیر سے بنائی گئی ہے، ماں حوا سے لے کر آج تک کی ساری عورتیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، انہیں آخر کون سمجھ پائے گا؟

وہ سوچ میں ڈوبا ہوا اپنے کمرے سے نکلا ہی تھا کہ اس کی نظر اپنی ماں عائشہ خانم پر پڑی اس نے سوالیہ نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔ ماں نے کہا، ”عامر بیٹے، تمہاری دلہن اپنے میکے چلی گئی ہے، جاتے ہوئے تمہارے لئے یہ پیغام چھوڑ گئی ہے، کہ تم اس سے ملنے کی کوشش نہ کرو، اور اس نے یہ بھی کہا کہ اس کی جانب سے تمہیں اجازت ہے کہ تم چاہو تو دوسری شادی کر سکتے ہو، وہ اپنے میکے جا رہی ہے، کیوں کہ وہ اس گھر میں مزید رہنا گوارا نہیں کرتی۔“

”لیکن امی جان یہ سب ہو کیا رہا ہے اس گھر میں؟ وہ روز روز کی اس گٹ گٹ سے عاجز آ گیا تھا، کسی پل سکون نہیں، آدمی دن بھر کاروباری مصروفیت کے بعد جب گھر لوٹتا ہے تو اس لئے کہ کچھ سکون حاصل کر سکے، اور اگر گھر پر بھی اسے مسائل میں الجھنا پڑے تو وہ گھر آئے ہی کیوں؟“ اس نے جھنجھلاہٹ سے بھرپور لہجے میں ماں سے کہا اور باہر نکل گیا۔

اور اسکوٹر پر سوار شہر سے دور بہت دور آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ ساحل سمندر سے قریب بنی ہوئی تفریح گاہ کا رخ کیا۔ وہاں سیمٹ کی بنی ہوئی بچوں میں ایک بچہ کا انتخاب کیا اور بیٹھ گیا۔ یہاں زندگی دل کش تھی، وہ یہاں کی رعنائیوں میں کھو کر جیسے اپنی ساری پریشانی بھولتا گیا۔ کیاریوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے، دور تک سبزہ زار یوں پھیلا ہوا تھا جیسے سبز مخملی چادر بچھادی گئی ہو، خوب صورت گول مٹی کے بچے مگن ہو رہے تھے، یہاں خوب صورت چہرے بھی تھے اور ریشمی آنچلوں کی سرسراہٹ بھی چند جوڑے قریب کی بچوں پر بیٹھے دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھی بیٹھی باتوں میں مگن تھے، طمانیت ان کے چہروں سے چھلک رہی تھی۔

سورج اب ڈھل چکا تھا اور دور بہت دور سمندر کے سینے میں ڈوب رہا تھا، سارے آسمان پر جا بجا سرخی پھیلی ہوئی تھی، یہاں لوگ میلوں دور سے بس یہی ایک منظر کو دیکھنے چلے آتے تھے، اتنا دل فریب منظر ہوا کرتا کہ انسان خود بخود قدرت کی اس تخلیق پر عیش عرش کراٹھتا اور خدا کی عظمت کا نشان اپنے دل پر نقش کر لیتا، عامر بھی غروب آفتاب کے اس دل فریب منظر میں جیسے کھوسا گیا اور سوچ کی کشتی پر سوار وہ ماضی کے سمندر میں دور تک نکلتا چلا گیا۔

یہیں عامر کی پہلی ملاقات شاہین سے ہوئی تھی، وہ اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ اس تفریح گاہ پر آیا کرتا۔ اس دن بھی وہ یہاں آیا تھا اپنے ایک دوست کے ساتھ، شاہین اس کے برابر کی بچہ پر بیٹھی تھی، وہ اتنی خوب صورت تھی کہ نگاہیں اس کے چہرے سے جیسے چپک کر رہ گئیں تھیں، دو ایک بار تو ان دونوں کی نگاہیں بھی ٹکرا گئیں، اس کے ساتھ غالباً ”کوئی سیلی تھی، اس نے عامر سے مخاطب ہو کر کہا“ اے مسٹر غروب آفتاب کا اتنا دل کش منظر ادھر ہے اور آپ ہیں کہ اس لڑکی میں کھوئے جا رہے ہیں“

”بھلا آپ کیا جانیں، میں تو اس منظر کا سارا عکس آپ کی سیلی کے چہرے پر دیکھ رہا ہوں بہت خوبصورت ہیں یہ آپ کی سیلی۔ کیا نام ہے ان کا؟“ اس نے بلا

”جھک پوچھ لیا“ ”ہائیں! جان نہ پہچان میں تیرا مہمان!“ اس نے تعجب سے عامر کو دیکھا۔
پھر پوچھنے لگی ”بھلا آپ ہیں کس کھیت کی مولیٰ؟“

”بندے کو عامر کہتے ہیں، گریجویٹیشن کر رہا ہوں، رہتا ہوں اس گلی میں جہاں
کبھی چچا مجنوں رہا کرتے تھے“ عامر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، اس نے دیکھا لڑکی
کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی جو اس کے حسن کو چار چاند لگا رہی تھی
، تھوڑی دیر بعد ہی وہ دونوں عامر اور اس کے دوست سے گھل مل گئیں، ایسا لگ رہا تھا
ان کی یہ پہلی ملاقات نہ ہو، بلکہ برسوں سے وہ ایک دوسرے کو جانتے ہوں، ان کی واپسی
بھی ان ہی کے ساتھ ہوئی، عامر اور اس کے دوست نے مل کر ان دونوں کو ان کے
گھروں تک چھوڑا اور پھر اپنے اپنے گھر لوٹ گئے۔

پہلی ملاقات اتنی خوش گوار تھی کہ انہوں نے دوسری ملاقات کا وقت بھی طے
کر لیا، اور اس طرح یہ ملاقاتوں کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا، ان کی رفاقت آہستہ آہستہ محبت
میں بدلتی گئی اور محبت اتنی گہری ہوتی گئی کہ انہوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
وقت آگے بڑھتا گیا، عامر نے گریجویٹیشن کی تکمیل کی اور ساتھ ہی کمپیوٹر
سائنس میں بھی ڈپلومہ کر لیا، وہ اب چاہتا تھا کہ خلیجی ممالک کا رخ کرے تاکہ زندگی
سنوارنے کیلئے کچھ نہ کچھ معاش کا بندوبست ہو سکے۔ جب اس نے شاہین سے اپنے اس
ارادے کا اظہار کیا تو وہ بصد ہو گئی کہ جاؤ ضرور لیکن شادی کے بعد، شاہین کی ضد کے
آگے اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنی ماں اور بڑے بھائی کو بھی منالیا، سر سے والد کا
شفیق سایہ تو اٹھ چکا تھا، بڑے بھائی ہی سارے سر پرست تھے، ماں اس کی سب کچھ تھیں
، چھوٹا بیٹا ہونے کے ناطے ماں اس کو بے حد چاہتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے
بیٹے کی پسند کو اپنی پسند پر ترجیح دی اور شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔

ایک مبارک دن وہ دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ شہنائیوں کی گونج
میں شاہین کو رخصت کر دیا گیا۔ وہ لباس عروسی میں واقعی پری لگ رہی تھی، اس کی شہابی
رنگت پر دلہن کا سنگھار اور سرخ عروسی جوڑا غضب ڈھا رہا تھا۔ دلہن کو جس نے بھی

کر سکو۔ ماں کا خط پڑھنے کے بعد شاہین پر اسے بے حد غصہ آیا اور ایک تکلیف دہ احساس بھی ہوا کہ اس نے جھوٹ کا سہارا کیوں لیا، اب اسے اپنے گھر ماں اور بچے کو دیکھنے کی تمنا ستانے لگی، وہ جلد سے جلد وطن لوٹ جانا چاہتا تھا۔

جیسے ہی معاہدے کی مدت ختم ہوئی اس نے واپسی کا ٹکٹ کٹوا لیا، جب وہ اپنے وطن لوٹا تو اسے بے پایاں خوشی کا احساس ہونے لگا، جیسے ہی وہ ایرپورٹ پر اترا، دوڑتا ہوا ڈیڑس گیلری کی طرف پہنچا جہاں اس کی ماں، بھائی، بھانج اور شاہین اپنے بچے کے ساتھ اس کے منتظر تھے، کسٹم سے چھٹکارا پا کر وہ باہر آیا۔

بھائی سے بغل گیر ہو گیا اور بھانج کی تعظیم میں جھک گیا۔ بھانج نے اسے پیار بھری چپٹ لگائی، پھر اپنے بچے بیبو کو لے کر پیار کرنے لگا۔ بچہ چونکہ پہلی بار باپ کے پیار کا لمس پا رہا تھا۔ اس لئے بے چہن ہو کر رونے لگا، بچے کو شاہین کے حوالے کر کے وہ اپنا سامان اکٹھا کرنے لگا، پھر یہ قافلہ گھر روانہ ہو گیا۔

چند روز گہما گہمی میں گزرے، پھر ایک دن ماں نے اسے اپنے پاس بلایا اور بینک پاس بک اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ اب کوئی اچھا سائزنس بڑے بھائی کے مشورے سے فوراً شروع کر دو۔“

پاس بک دیکھنے کے بعد اسے اتنی خوشی ہوئی کہ وہ بے اختیار ماں کے سینے سے لپٹ گیا اور بے اختیار آنسو اس کی آنکھوں سے نکل پڑے، ماں نے اسے سمجھایا تو اس نے کہا ”نہیں امی، میرے یہ آنسو عقیدت کے آنسو ہیں، مجھے یہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہو رہی ہے کہ آپ نے میری بھیجی ہوئی ایک ایک پائی بچا کر رکھی ہے، آپ اگر چاہتیں تو سب کچھ خرچ کر سکتی تھیں“

اس دن اس کے دل میں ماں کی عظمت کا ایک نشان سا نقش ہو گیا اور ساتھ ہی شاہین پر اسے بے اختیار غصہ آیا کہ ایسی فرشتہ صفت ماں پر اس نے جھوٹا اور بے ہودہ الزام لگانے کی کوشش کی تھی، شاہین کی یہ حرکت اس کے دل میں پھانس بن کر چھ گئی، اور اس کے اعتماد میں اک دراڑ پیدا کر گئی، جب اس نے شاہین سے پوچھا تو وہ

دیکھا عامر کی پسند کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

جملہ عروسی میں جب عامر نے قدم رکھا تو ہر طرف خوشبو مہک رہی تھی، گلاب اور موگرے کے پھولوں سے کمرہ سجایا گیا تھا، جملہ عروسی میں اس کی دلسن یوں گردن جھکائے بیٹھی تھی جیسے کوئی اجنبی لڑکی ہو، جب عامر نے اس کا گھونگھٹ الٹا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا، ”سبحان اللہ! ایک بیک اس کی زبان سے نکلا وہ بالکل چودھویں رات کا چاند لگ رہی تھی، جس کی پر نور شعاعوں سے اس کی زندگی چمک اٹھی، وہ آج ایک نئی زندگی میں قدم رکھ رہے تھے، جس میں پیار، محبت، اعتماد اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے ساتھ گھر کی ذمہ داری کا احساس بھی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ بڑوں کی عزت چھوٹوں پر شفقت اور گھر کے ہر فرد کے احساسات کا خیال رکھنا ہوتا ہے، کبھی ایثار سے کام لینا پڑتا ہے، تو کبھی قربانی بھی دینی پڑتی ہے، ان نکات اور رموز کو اگر کوئی لڑکی سمجھ لے تو وہ ایک کامیاب بیوی بھلائی ہے۔

شادی کے ہنگامے جیسے ہی ختم ہوئے عامر خلیجی ممالک میں ملازمت کی تلاش کیلئے کوشاں ہو گیا، بہت جلد اسے ریاض کی ایک بہت بڑی کمپنی میں معقول تنخواہ پر ملازمت مل گئی، اور وہ چلا گیا، وہاں اس نے اپنی محنت اور جدوجہد سے کافی پیسہ کمایا۔ اپنی ساری کمائی وہ گھر بھیج دیتا۔ اسے شاہین کے خطوط سے گھر کے حالات کا علم ہوتا رہا، وہ ہر وقت ماں کی شکایتیں لکھا کرتی اور یہی باور کراتی کہ تمہاری محنت کی کمائی یہاں بے دریغ لٹانی جا رہی ہے۔ تم جلد چلے آؤ یہاں پہنچ کر بھی کچھ نہ کچھ کمایا ہی جاسکتا ہے، لیکن چونکہ معاہدہ دو سال کا تھا، اسلئے عامر چاہتے ہوئے بھی واپس نہیں آسکتا تھا۔

اسی مدت میں اسے یہ خوش خبری بھی ملی کہ ان کی زندگی کے آنگن میں ایک خوب صورت پھول کھلا ہے، ہر ایک نے مبارک بادی کے خطوط لکھے، ماں نے بھی مبارک باد دی اور دعائیں لکھیں اور انہوں نے یہ بھی لکھا کہ تمہاری بھیجی ہوئی ایک ایک پائی یہاں محفوظ رکھی گئی ہے تاکہ تم جب واپس لوٹو گے تو اپنا کوئی بزنس شروع

ٹال گئی اور اس نے مزید جھوٹ کا سہارا لیا، پھر ان دونوں کے درمیان خلیج بڑھتی ہی چلی گئی، ہر روز چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا کھڑا ہوتا، اور وہ غصہ میں بھرا بغیر کچھ کھائے گھر سے نکل پڑتا، اس نے شاہین کو بہت سمجھایا اور کھال جل کر رہنے میں سب کی بھلائی ہے اور پھر اسے بزنس کے میدان میں اپنے قدم بھی تو جانے ہیں لیکن شاہین نہ مانی، اس کی ایک ہی حسد تھی کہ اگر وہ اس کا ساتھ چاہتا ہے تو علیحدہ گھر لے ورنہ وہ چلی جائے گی، اور آج واقعی وہ جا چکی تھی۔

ماضی میں اپنی زندگی کے گزرے ہوئے لمحوں کا حساب کرتے کرتے عامر حال میں لوٹا تو کافی رات ہو چکی تھی، چاند آسمان پر چمک رہا تھا اور چھوٹے چھوٹے تارے ٹمٹم رہے تھے، اسے بے اختیار اپنے بچے بلو کی یاد آ گئی، کتنا معصوم تھا وہ، بالکل ان ٹمٹماتے تاروں کی مانند مسکراتا تھا۔ پھر یک بیک اسے کوثر یاد آ گئی، کوثر امید کی ایک کرن بن کر چمکی تھی، اس سلسلہ میں وہ اس کی ضرورت مدد کرے گی۔ یہ کوثر وہی لڑکی تھی جو ان دونوں کی محبت کی ہمراز تھی، اس نے سیدھا کوثر کے گھر کا رخ کیا۔

کوثر نے جب سارے حالات سنے تو اس نے عامر سے پوچھا ”اب آپ کا اگلا قدم کیا ہو گا؟ ایک ضروری سوال یہ بھی ہیکہ کیا آپ دوسری شادی کرنے کو تیار ہیں؟ اور اگر تیار نہ بھی ہوں تو اب تیار ہو جائے، یہی ایک شاہین کے مرض کا علاج ہے۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ وہ بوکھلا گیا، دوسری شادی، میں تو سوچ بھی نہیں سکتا، آپ تو جانتی ہی ہیں کہ میں نے ہمیشہ ساتھ نبھانے کی قسم کھائی ہے، اور میں اپنا وعدہ وفا کرنا چاہتا ہوں، اور پھر مجھ سے دوسری شادی کرے گا بھی کون، کوثر کے سوالوں سے وہ گھبرا سا گیا۔

میں کروں گی آپ مجھے ساتھ شادی، پھر اس نے ایک ترکیب اسے بتائی، وہ مطمئن سا وہاں سے چلا آیا۔

ادھر شاہین اپنے میکے چلی تو گئی لیکن جب خبر چھٹا تو بھی بجھی سے رہنے لگی، اک عجیب سا احساس اس کے دل میں ابھرنے لگا، چند دن تو گھر کے سب ہی لوگ

اس کی دل جوئی کرتے رہے اس کے بھائیوں نے اسے سمجھایا بھی کہ جو قدم اس نے اٹھایا ہے وہ غلط ہے، اس طرح بغیر عامر کی اجازت لئے گھر نہیں چھوڑنا چاہئے تھا۔ لیکن چونکہ چھوٹی بہن تھی، اس لئے دلاسا بھی دیا، پھر جیسے ہی دن گزرتے گئے اس کی بھابیوں کی سرگوشیوں کی سرسراہٹ اس کے کانوں تک پہنچنے لگی، کبھی کھلے طور پر اور کبھی دبے دبے لہجے میں انہوں نے اسے طعنے دینے شروع کر دیئے، اب اسے احساس ہونے لگا کہ اس نے بہت بڑی غلطی کی ہے، شوہر چاہے جیسا بھی ہو، وہ عورت کیلئے ایک مضبوط سہارا ہوتا ہے، وہ ایک ایسا سایہ دار درخت ہوتا ہے جس کے سائے میں میٹھی تیند سوئی جاسکتی ہے، لیکن اب کیا صورت لے کر جائے گی وہ اپنے سسرال؟ اس کی اما اس کے آگے دیوار بننے لگی، پھر اس نے خود کو حالات کے حوالے کر دیا۔

وہ دن شاہین کیلئے قیامت سے کم نہ تھا جب اس کی میز پر ایک سرخ فیتے سے بندھا ہوا شادی کا کارڈ پڑا تھا، عامر دوسری شادی کر رہا تھا اور لڑکی کوئی اور نہیں اس کی اپنی سسلی کوثر تھی، شادی دو دن بعد تھی، وہ سوچ رہی تھی کہ آج سے صرف بہا تر گھنٹے بعد عامر کو وہ ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھے گی، اس میں عامر کا کوئی قصور بھی تو نہ تھا، وہ خود ہی تو بڑے زعم سے اسے دوسری شادی کی اجازت دے آئی تھی، اب اسے کیا کرنا چاہئے؟ وہ رات بھر نہ سو سکی، رات بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتی گزر گئی، لیکن صبح ہونے سے قبل اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

آج کی صبح اس کی زندگی کی بہت اہم صبح تھی، وہ اٹھی اور نہانے کیلئے باتھ روم چلی گئی، نہانے کے بعد وہ خود کو کچھ ہلکا سا محسوس کر رہی تھی، خوب صورت لباس زیب تن کرنے کے بعد اس نے بیلو کو بھی صاف لباس پہنایا اور اپنا سوٹ کیس لے کر کمرے سے باہر آگئی۔

اس کی ماں اور بھائیوں نے دیکھا تو حیران رہ گئے، ماں نے پوچھا، ”کہاں جا رہی ہو شاہین؟“ اس نے دبی زبان اور جھکی ہوئی آنکھوں سے کہا اپنے گھر۔“

جب وہ سسرال کی دہلیز پر کھڑی کال بیل کا بٹن دبا رہی تھی تو نہ جانے کیوں اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، کچھ لمحوں کے بعد جب دروازہ کھلا تو اس کی جیٹھانی نے معنی خیز مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور بلو کو لیکر سینے سے بھینچ لیا، اور پیار کرنے لگیں، اسے اپنے ہمراہ اس کے کمرے تک لے گئیں جہاں عامر اپنے بستر پر دراز کسی رسالے کے مطالعہ میں مصروف تھا، بھابی نے اسے آواز دی اور کہا عامر دیکھو تو کون آیا ہے! ”وہ یک بیک چونک پڑا اور اٹھ بیٹھا، پھر بھابی تنہا چھوڑ کر چلی گئیں۔

وہ عامر کے سامنے کسی مجرم کی طرح سر جھکائے اور آنکھوں میں ندامت کے آنسو لے کھڑی رہی عامر آگے بڑھا اور اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا، اب بھی شاہین کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

اتنے میں پیچھے ایک قہقہہ بلند ہوا تو شاہین نے پلٹ کر دیکھا، سامنے اس کی سہیلی کوثر کھڑی مسکرا رہی تھی، پھر کوثر نے کہا ”کیوں بنو! آگئی ہونا چکر میں! وہی دوسری شادی والا چکر! اس کے بعد اس نے عامر سے کہا ”چلتے عامر صاحب، مٹھائی منگوایے، ہماری چال کام یاب رہی، پھر وہ سنجیدہ لہجہ اپناتے ہوئے کہنے لگی، ”شادی کوئی گڈا گڑیا کا کھیل نہیں کہ کچھ دن کھیلا اور بس کھیل ختم، یہ عمر بھر کا بندھن ہے، اسے مضبوطی سے باندھے رکھنا، اس بندھن کی ڈور پیار ایشاد قربانی اور ایک دوسرے پر بھرپور اعتماد کے انمول دھاگوں سے بنتی ہے، سمجھی پگلی! اس نے شاہین کو گلے لگایا اور چلی گئی۔

جب کوثر چلی گئی تو شاہین کے دل میں اپنے لئے عظمت کا ایک امنٹ نقش چھوڑ گئی، باہر نیلے آسمان پر پرندوں کے جھنڈ آگے ہی آگے چلے جا رہے تھے، آج کی یہ صبح شاہین کیلئے زندگی کا نیا پیغام لے آئی تھی۔

فاصلے سمٹ گئے

”ارے او بڑی بی، کیا کر رہی ہو۔؟“ جب ایک جانی پچانی مردانی آواز اسکی سیاحت سے ٹکرائی اور پھر۔ بڑی بی کے لقب سے نوازنے کی ہمت کرنے والا بھلا کون ہو سکتا ہے، کس کی شامت آئی تھی کہ اسے اس لقب سے نوازتا۔! رخسار جو کہ صبح صبح صحن میں کیاریوں میں لگے گلاب کے پودوں کو تراشنے میں مشغول تھی کہ آج برسوں بعد کسی نے اسے بڑی بی کہہ کر مخاطب کیا۔ وہ جب پلٹی تو دیکھا سامنے چھ فٹ کا دراز قد خوب رو نوجوان انتہائی صاف ستھرا دیدہ زیب لباس زیب تن کئے ہوئے تھا اسے میٹھی میٹھی نظروں سے نکلے جا رہا تھا۔

”جلیل آپ۔ آپ کب آئے۔؟“ اس پر جیسے یلکنت حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں وہ اپنی آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے گئی، جلیل جو کہ سات سمندر پار ملازمت پر گیا ہوا تھا اس طرح بغیر کسی اطلاع کے اچانک ہی اسکے دروازہ کھڑا ہو جائیگا اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔!

”کل رات کی فلائٹ سے آیا ہوں، پروگرام کچھ اتنا جلدی میں بن گیا کہ کسی کو آنے کی اطلاع تک نہ دے پایا، گھر پر بھی سب لوگ جیسے پریشان سے ہو گئے، ممی پاپا اور ریشماں کسی کو بھی یقین نہ آیا کہ میں انکے سامنے کھڑا ہوں، وہ بھی مجھے یوں تکنے لگے جیسے میں کوئی جیتا جاگتا جن کی شکل میں وارد ہو گیا ہوں“ جلیل نے اسے تفصیل سنائی۔

”رخسار بیٹی کون آیا ہے۔؟“ رسوئی گھر سے سعیدہ خاتون نے آواز دی تو اس نے رسوئی گھر کا رخ کیا، ”امی جلیل آئے ہیں“

”کون جلیل۔ اپنا جلیل“۔؟ سعیدہ خاتون نے بھی غیر یقینی کیفیت میں سوال کیا، ”اسلام و علیکم خالہ جان۔!“ جلیل نے بڑے ادب سے انھیں سلام کیا۔

وعلیکم السلام بیٹا۔ جیتے رہو، لمبی عمر پاؤ۔! اللہ تمہیں دین و دنیا میں اعلیٰ مقام عطا کرے کب آئے بیٹے۔! ”انمول نے اسے دعاؤں سے نوازا۔

”کل رات آیا ہوں خالہ جان بس اچانک ہی پروگرام بن گیا اور چلا آیا۔ سوچا کہ ہر ایک کو سر پر اندر دوں۔!“

”چلو ٹھیک کیا جو چلے آئے، موٹی باہر کی کمانی ہر ایک کو ایسا چسکا لگا ہے کہ صورت تک دیکھنے کو ترس رہے ہیں ہم لوگ، سب خیر خیریت تو ہے نا بیٹا، سنا ہے سعودی حکومت اب آہستہ آہستہ باہر والوں کو واپس بھیج رہی ہے۔!“

”ہاں خالہ جان۔ آپ لوگوں نے ٹھیک ہی سنا ہے، جو باہر کے لوگ اونچے عہدوں پر کام کر رہے ہیں اب سعودی حکومت چاہتی ہے کہ ان پر مقامی لوگ کام کریں اور آہستہ آہستہ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو واپس بھیجا جا رہا ہے اور ان کی جگہ مقامی حضرات لے رہے ہیں۔ ویسے وہ لوگ بھی اب ناخواندہ نہیں رہے، وہ لوگ بھی اب اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وطن لوٹ رہے ہیں اور کام کرنے میں دلچسپی لے رہے ہیں، ویسے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرا پوزیشن کمپنی میں بہت اچھا ہے، چار سال بعد پہلی بار چھٹی لی ہے“ جلیل نے تفصیلی طور پر وہاں کے حالات سے انھیں آگاہی دی۔

اللہ مبارک کرے تمہیں اور اعلیٰ مقام عطا کرے، یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ تم بہت اچھی پوزیشن پر کام کر رہے ہو، ارے بیٹی رخسار کیا یوں ہی باتیں ہوتی رہیں گی، کچھ ناشتہ پانی کا خیال بھی کر دو گی یا اسے یوں ہی کھڑا رکھو گی، ”سعیدہ خاتون نے رخسار کو آواز دی۔

”میں نہیں جانتا تھا کہ یہ پڑھ لکھ کر اتنی بد اخلاق ہو جائیگی، دیکھا خالہ جان آپ نے مجھے آئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو رہا ہے لیکن اس نے مجھے بیٹھنے کو تک نہیں پوچھا، کیا یہاں تعلیم حاصل کر کے لڑکیاں گنوار ہو جاتی ہیں۔!“ جلیل کی رگ شرارت پھر کی

اور مسکراہٹ انکے ہونٹوں پر پھیلنے لگی۔ اے مسٹر آتے ہی شروع ہو گئے، اپنی یہ اکڑ جا کر سعودی عرب میں دکھاؤ، یہاں پر جناب کی دال گلنے والی نہیں سمجھ کچھ، رخسار کھان چپ رہنے والی تھی، پھر اسے بھی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا ”چلو بہت ہو چکا، اب اندر بھی کھسکو نجانے کب کے بھوکے ہو کچھ دال روٹی دے ہی دوں گی“

ارے ارے یہ کیا بیٹی، یہ گھر آئے مہمان سے کیا کوئی اس طرح بھی پیش آتا ہے یہ تو سراسر بد تمیزی کھلائے گی، سعیدہ خاتون نے رخسار کو ڈانٹتے ہوئے کہا تو وہ رسوئی گھر چلی گئی۔

گرم گرم قیمہ پرائے اور کھڑی پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد رخسار کے ہاتھوں کی بنی ذائقہ دار چائے پی کر جلیل جب لوٹنے لگے تو جاتے ہوئے انہوں نے آہستہ سے رخسار کی چوٹی کھینچی اور کہا ”بڑی بی شام میں گھر آنا مت بھولنا میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

رخسار نے ناشتے کے برتن سمیٹے اور دسترخوان جھٹک کر رکھ دیا، پھر اپنے کمرے میں چلی آئی بستر پر لیٹی ہی تھی کہ جلیل کا خوب رو پیکر اسکی لگا ہوں کے سامنے رقص کرنے لگا، وہ ابھی کچھ دیر قبل ہی اسکے پاس سے گیا تھا، وہ گیا تو تھا لیکن کچھ میٹھی کچھ کڑوی یادیں چھوڑ گیا تھا اور وہ ان میٹھی کڑوی یادوں میں کھوتی جا رہی تھی۔

اے چپکلی یہاں خالہ جان کے ساتھ کیوں چپکی بیٹھی ہو، چلو باہر چھا چھی کھیلتے ہیں جلیل جو کہ عمر کی چودھویں سیڑھی پر قدم رکھنے جا رہا تھا، رخسار کو چھیرتے ہوئے کہنے لگا۔ اے گورے بندر یہاں سے چپ چاپ چلے جاؤ۔ میں نہیں کھیلتی بندروں کے ساتھ سمجھے !، ”کیسے نہیں کھیلتی ہو، میں بھی دیکھتا ہوں۔ !“ جلیل نے اسکے دراز بالوں کی موٹی موٹی چوٹی کھینچی چلتی ہو کہ نہیں !

”چلتی ہوں بابا چلتی ہوں، پہلے میری چوٹی تو چھوڑو۔ وہ بلبلا نے لگی، پھر تھوڑی سی دیر میں وہ کھیل میں مشغول تھے۔“

یہ تھا انکا بچپن، جلیل اور رخسار خالہ زاد بھائی بہن تھے، سعادہ خاتون بڑی تھیں اور شمیمہ خاتون چھوٹی، دونوں کی شادیاں دو سال کے وقفے سے ہوئی تھیں، انھیں خاندان ہی میں بیابا گیا تھا، یہ لوگ آپس میں بڑی محبت اور خلوص سے رہتے تھے، جلیل کے ابو رفیع الدین صاحب محکمہ مال میں اچھے عہدے پر فائز تھے اور رخصی کے بابا شکیل صاحب محکمہ تعمیرات میں انجینئر تھے یہ دونوں ہی ایمانداری کے معاملے میں ایک ہی اصول پر کلابند تھے سارے محکمہ میں مشہور تھے اونچے عہدیداروں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

رخسار سے چھوٹی ایک بہن اور دو بھائی تھے جلیل کی بھی ایک چھوٹی بہن ریشما تھی جو کافی نٹ کھٹ قسم کی تھی، یہ دونوں بڑے لاڈلو پیار سے پلے بڑے تھے، جلیل کے مزاج میں سنجیدگی کے ساتھ ہلکی سی شرارت بھی رچی ہوئی تھی اور جب کبھی انکا شرارت کا موڈ ہوتا وہ سیدھے اپنی خالہ کے گھر آتے اور رخصی کو تنگ کرتے، ان کی پھیمڑ چھاڑ بڑی پیاری ہوتی، ان دونوں کی عمروں میں صرف تین سال کا فرق تھا، ساتھ ساتھ بڑے ہوئے تھے اور ساتھ ساتھ ہی کھیلے کودے تھے، دونوں کی عمریں ابھی اس قابل نہ تھیں جبکہ جذبہ محبت و چاہت نمودار ہوتا ہے، لیکن ایسا ضرور تھا کہ وہ دونوں اگر ایک دوسرے نہ مل پاتے تو ضرور کھی محسوس کرتے۔

طاہر وقت بھی کہیں رکا ہے، وہ اپنے پر پھیلے برسوں کے افق پر محو پرواز تھا، کل کے کمسن بچے آج جوانی کی دلیز پر قدم رکھ رہے تھے، والدین کی عمروں کو پہنچ گئے تھے اب جلیل کل لڑکے سے نکل کر یونیورسٹی پہنچ گئے تھے اور پوسٹ گریجویشن کر رہے تھے، رخسار بھی گریجویشن کے آخری سال کی طالبہ تھی بچپن کا وہ تنکھا مزاج اب سنجیدگی میں تبدیل ہو گیا تھا، وہ دونوں ہی کافی سنجیدہ طبیعت کے مالک ہو گئے تھے، لیکن کبھی کبھی جلیل کی رگ شرارت جب پھر مکتی تو وہ پھر چودہ برس عمر والے جلیل بن جاتے، ایسے وقت بھی رخسار کو اپنے لئے ان سے بچائے رکھنا مشکل ہو جاتا، ان دونوں میں اب وہ

جذبہ بھی پیدا ہونے لگا تھا جسے زمانہ محبت اور چاہت کا نام دیتا ہے، لیکن دونوں ہی نے کبھی اظہار کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور بس اپنی آنکھوں کو ترسیل محبت کا ذریعہ بنایا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں دل کی باتیں کرتے اور سمجھتے۔

تعلیم ختم کر کے جلیل نے جب دیکھا کہ ہندوستان میں ملازمتوں کے دروازے ہر طرف بند ہی بند ہیں تو انہوں نے غلیبی ممالک کا رخ کرنے کی ٹھانی۔ تھوڑی سی کوشش ہی ثمر آور ثابت ہوئی اور بہت جلد الکا انتخاب ایک بہت اچھی امریکن کمپنی کے لئے ہو گیا۔ انکے جانے کے تمام مراحل یکے بعد دیگرے طے ہوتے گئے اور پھر وہ دن بھی آ گیا کہ انھیں سب کچھ چھوڑ کر اور اپنوں سے بچھڑ کر پرواز کرنا تھا، جانے سے ایک دن قبل انہوں نے رخسار سے ملاقات کی، تب اپنے جذبہ محبت کا اس سے اظہار کیا اور کہا کہ وہ اسکا انتظار کرے گی، وہ کہیں بھی رہیں رخسار ہی ان کی منزل ہے، انکی بات سن کر رخسار کی پلکوں میں ستارے ٹمٹمانے لگے، وہ خود پر قابو نہ رکھ پائی، اس نے اپنی جبین انکے کاندھے پر رکھ دی اور آنسو ضبط کا باندھ توڑ کر بہنے لگے انہوں نے اسے سمجھایا اور کہا کہ یہ وقتی دوری ہے، اللہ نے چاہا تو بہت جلد وہ لوٹ کر اسے اپنا بتالیں گے۔ انہوں نے اسکے رخسار پر ڈھلک آئے ان شبی قطروں کو اپنے رومال میں جذب کیا اور کہا ”رخسار یہ آنسو نہیں بلکہ میری محبت کے انمول موتی ہیں جسے میں اپنے رومال میں محفوظ کئے جا رہا ہوں۔ یہ رومال ہر وقت مجھے ہماری اس ملاقات کی یاد دلاتا رہیگا۔ بددخی تمھیں دیکھے بغیر میں وہاں کیسے رہ پاؤں گا۔ میں نہیں جانتا مجھے اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھنا۔ خدا حافظ۔!“

جلیل جب اس سے بچھڑ کر جانے لگے تو رخسار کو یوں لگا جیسے اسکے سینے میں دل نہیں رہا، جلیل جیسے اپنے ساتھ لئے جا رہے ہوں، وہ ٹرپ اٹھی اور ایک بار پھر اسکی آنکھوں کے پیمانے لبریز ہونے لگے، اسکے خوبصورت نازک لب لے اور کہا ”اللہ حافظ۔ وہ ضرور تمھیں میرے لئے بحفاظت واپس لے آئیگا۔ انشاء اللہ۔“

جلیل کے جانے کے بعد رخسار کچھ دنوں تک بھی بھی سی رہی ایک عجیب سے خالی خالی پن کا احساس اسے ستائے رہتا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور آہستہ آہستہ زندگی کی گماگمائی میں خود کو مشغول کرتی گئی، وہ کل پابندی سے جاتی رہی، اسکی چھوٹی بہن اور بھائی بھی تعلیم میں بہت آگے جا رہے تھے، اسکے ابو شکیل صاحب ایک نیک صفت اور نفس پر قابو رکھنے والے انسان تھے ان کی زندگی پر سکون گزر رہی تھی کہ اچانک ہی ایک بھونچال آگیا، سمجھتے ہیں زندگی نشیب و فراز دھوپ چھاؤں اور حوادث کا نام ہے، کب کیا ہونے والا ہے کوئی نہیں جانتا، سعیدہ خاتون کے لیے شکیل صاحب کی رفاقت تپتی ہوئی دھوپ میں کسی سایہ دار درخت کی مانند تھی، انکی زندگی بڑے سکون اور راحت میں گزر رہی تھی کہ اچانک ہی انکی پرسکون زندگی میں مصائب آلام لیے بھونچال آگیا، انکے سارے خواب جو کہ انہوں نے اپنے رفیق زندگی کے ساتھ مل کر بنائے تھے ان واحد میں شکوں کی مانند بکھرتے چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے آگے بھی بھلا کوئی کچھ کر سکتا ہے۔ اچانک ہی انکے سروں سے شکیل صاحب کا سایہ اٹھ گیا اور اللہ نے انہیں رنج و الم کے بحر بیکراں میں ڈھکیل دیا، یہ سانحہ ان کی زندگی کا عظیم سانحہ تھا وہ باوجود تحفہ عزم و حوصلہ رکھنے کے خود کو بے حد کمزور محسوس کرنے لگیں، ٹوٹ سی گئیں، شوہر کی ناگہانی جدائی نے انکی زندگی میں ایسا خلاء پیدا کر دیا تھا کہ پر ہونا ناممکن تھا۔ لیکن رخسار ایک باہمت لڑکی تھی، اس نے اپنی ماں سعیدہ خاتون کی ٹوٹی ہمت کو سہارا دیا۔ ”ای جان مصائب کا دینے والا ہی مصائب کا دور کرنے والا ہے۔ ہمیں ہمت سے حالات کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے، اپنے بندوں کیلئے ستر ماؤں کی محبت رکھنے والا ہے۔ وہ ضرور رحم کرے گا ہمیں اس ذات عالی سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔“

”ہاں بیٹی۔ تم ٹھیک سمجھتی ہو، وہی ساری کائنات کا مالک ہے وہ رحمان ہے، وہ رحیم ہے، وہ ضرور ہمارے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ کرے گا، ہمیں صبر ہمت و استقلال

سے کام لینا ہوگا۔ ”سعیدہ خاتون نے اپنی لخت جگر کو سینے سے بھینچتے ہوئے کہا اور اپنی ساڑی کے آنچل میں آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو جذب کیا۔

بچتے ہیں اللہ رب العزت بڑا بے نیاز ہے اپنے بندوں کیلئے جب ایک در بند کرتا ہے تو دس در کھول بھی دیتا ہے۔ رخسار کی معمولی سی کوشش پر اسے اپنے مرحوم والد کی جگہ ملازمت مل گئی چونکہ آجکل ہر سرکاری محکمہ میں کمپیوٹر کا استعمال لازمی قرار دیا گیا ہے، رخسار جس نے گریجویشن کے ساتھ کمپیوٹر ٹکنالوجی میں ڈپلوما بھی حاصل کیا تھا اسے کمپیوٹر پروگرامر کی پوسٹ پر ملازم رکھ لیا گیا اب ان کے معاشی مسائل اللہ تعالیٰ نے حل کر دیئے تھے، باپ کی کمی کسی حد تک پوری ہو گئی تھی، چھوٹے بھائی اور بہن کی تعلیم کسی رکاوٹ کے بغیر چلنے لگی تھی، رخسار نے سارے گھر کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ سعیدہ خاتون اور رخسار دونوں ہی قابل تعریف تھیں کہ انہوں نے حالات کا بلند ہمتی سے مقابلہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی آزمائشوں پر پورا اتری تھیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ نے انکی کشتی حیات منجھدار سے نکال کر بحفاظت ساحل کی جانب کر دی تھی۔

انسانی فطرت بھی عجیب ہوتی ہے، انسان جب ایک فکر سے آزاد ہوتا ہے تو کسی دوسری الجھن میں خود بخود گرفتار ہو جاتا ہے، یہی حال سعیدہ خاتون کا تھا، فکر معاش جب دور ہوئی تو ایک دوسری فکر نے انھیں آگھیرا، جیسے جیسے رخسار اپنی عمر کے زینے طے کرنے لگی انکی فکر میں اضافہ ہونے لگا، وہ چاہتی تھیں کہ جلد از جلد اسکے ہاتھ میلے کر دیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی خیال انھیں پریشان کئے رہتا کہ اسکی شادی کے بعد اس گھر کی ضرورتوں کا کیا ہوگا، پھر یہ سوچ کر خود کو مطمئن کرنے کی سعی کرتیں کہ اللہ بڑا کارساز ہے کوئی نہ کوئی حل تو بہر حال نکل ہی آئیگا، رخسار کی مرضی اسکی چاہتوں سے لاعلم سعیدہ خاتون نے اپنے ملنے پھلیوں اور دو ایک مشاطاؤں سے بھی کہہ رکھا کہ کوئی معقول رشتہ رخسار کے لئے تلاش کریں۔ اور پھر انہوں نے اپنے طور پر اسکی شادی کی تیاری بھی شروع کر دی۔

رخسار جب ماں کی فکر سے واقف ہوئی اور اسے یہ پتہ چلا کہ مختلف ذریعوں سے اس کیلئے رشتہ ڈھونڈا جا رہا ہے تو وہ پریشان ہو گئی۔ وہ دل ہی دل میں خوف کھانے لگی کہ اگر اس کی شادی کہیں اور طے پا گئی تو وہ جلیل کو کیا جواب دے گی۔ ان سے کئے ہوئے وعدوں کا کیا ہو گا۔ کیا وہ انکی نگاہوں سے گر نہیں جائے گی، کیا سوچیں گے وہ اس کے متعلق اس پر لعنت بھیجیں گے کہ وعدے تو بہت کئے تھے لیکن وفانہ کر سکی۔ بے وفائی کا بد نما داغ اس کی پاک جبیں پر لگ جائے گا۔ ان ہی سوچوں نے اس کے بدن میں جھر جھری سی پیدا کر دی پھر سر بسجود ہو کر مالک دونوں جہاں کے آگے دست سوال دراز کر گئی ”یا اللہ تو ہی للج رکھنے والا ہے تو ہی اپنے بندوں کی عزت و ناموس کا پاسبان ہے“ اے اللہ میری للج رکھ لے اور اس مسئلہ کو حل فرما۔ ! ”وہ اللہ سے رو رو کر دعائیں مانگنے لگی۔

رخسار کی پریشانیوں سے بے خبر سعیدہ خاتون اپنے کئے ہوئے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کی تگ و دو میں مصروف ہو گئیں، انھیں رخسار کی محبت اسکی پریشانیوں کا علم نہ تھا سوچ سوچ کر رخسار جب کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی تو اس نے جلیل کی بہن ریشماں سے مدد لینے کیلئے اسے بلا بھیجا۔ وہی اسکی دوست تھی، اسکی خوشیوں کی غموں کی ہمارا تھی وہ جب آگئی تو اسے لے کر رخسار اپنے کمرے میں چلی آئی۔

”کو میری بنو کیا مسئلہ ہے تم کچھ بھی بھیجی سی کچھ پریشان پریشان سی لگ رہی ہو“ ریشماں نے نرم نرم صوف پر بیٹھتے ہوئے استفسار کیا۔

”ریشو۔ جب سے مجھے پتہ چلا ہے کہ امی جان میرے لئے رشتہ تلاش کر رہی ہیں، میں بڑی الجھن میں مبتلا ہو گئی ہوں، ان سے براہ راست میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میں اور جلیل ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور میں شادی کرونگی تو صرف جلیل سے ورنہ نہیں۔ رخسار نے اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔

کیوں نہیں بھی، جب تم بھی اسے محبت کرتی ہو اور تم دونوں نے ساتھ جینے

مرنے کی قسمیں کھاتی ہیں تو تم میں اتنی ہمت تو ہونی ہی چاہئے کہ ان سے یہ سب کچھ کہہ سکو، کیا میں یہ سمجھوں کہ میری ہونے والی بھابھی اتنی بزدل ہے۔ ! ” ریشماں حسب عادت اسے تنگ کرنے پر اتر آئی۔

” میں تمہارا سر توڑ دوں گی سمجھیں کچھ، میری یہاں جان نکلی جا رہی ہے اور تم ہو کہ مذاق بنا رہی ہو۔ “ اس نے ناراض ہوتے ہوئے کہا اور آنکھیں جھلم جھلم کرنے لگیں۔ یہ دیکھ کر ریشماں اٹھی اور اسے خود سے قریب کرتے ہوئے کہنے لگی ” ارے یار تم تو واقعی رونے لگیں، مجھے معاف کر دو، تم فکر مت کرو، میں کوئی نہ کوئی ترکیب نکال ہی لوں گی، میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں میرے بھیا سے کوئی نہیں چھین سکتا، تم صرف اور صرف میری بھابی ہوگی، انشا اللہ۔ ! ” ریشماں نے اس کے آنسو اپنی اوڑھنی کے دامن میں جذب کئے اور کہا ” یہ آنچل ہی تو عورت کا عمگسار ہوتا ہے نجانے اس میں کتنے ہی آنسو سمائے رہتے ہیں یہ آنسو اور آنچل کا رشتہ اتنا اٹوٹ کیوں ہوتا ہے۔ “

رخسار جب کچھ بحال ہوئی تو اس نے رسوئی گھر کا رخ کیا تاکہ ریشماں کیلئے کچھ چائے ناشتے کا بندوبست کرے، ادھر ریشماں سعیدہ خاتون سے مل کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی، چائے سے فراغت کے بعد جب ریشماں چلی گئی تو رخسار کو نجانے کیوں ایک گونہ سکون کا احساس ہوا، اسے ریشماں پر بے حد اعتماد تھا اور یقین تھا کہ اسکی اس الجھن کا حل وہ ضرور ڈھونڈ نکالے گی، آج اسے ابو بہت یاد آنے لگے، وہ زندہ ہوتے تو اپنے دل کی بات ان سے بڑی آسانی سے منوالیتی کتنا چاہتے تھے وہ اسے، اسکی ہر ضد پوری کرتے، جو فرمائش وہ کرتی وہ چیز حاضر کر دیتے، وہ اکثر اسے خود سے قریب کرتے ہوئے سعیدہ خاتون سے کہتے ” سعیدہ تم رخسار کو بیٹہ نہ سمجھو یہ تو میرے لیے بیٹا ہی ہے تم دیکھنا یہ ضرور ہمارے لیے بیٹا ثابت ہوگی۔ ! اور ان کی یہ بات واقعی سچ ثابت ہو گئی انہوں نے اس جہان فانی سے کوچ کیا اور رخسار کو اپنے ابو کی کبھی بات سچ ثابت کرنی پڑی آج وہ سعیدہ خاتون کے لیے کسی بیٹے سے کم نہ تھی، ابو کو یاد کر کے اسکی آنکھوں

میں نمی تیرنے لگی۔ ان ہی خیالوں میں غلطاں وہ ماضی کے افق پر محو پرواز تھی کہ سعیدہ خاتون کی آواز پر وہ چونک کر اٹھ بیٹھی وہ کہہ رہی تھیں ”رخسار بیٹی کیا سو رہی ہو، دن ڈھل رہا ہے چائے تو بنا دو“ ابھی آئی امی۔ اس نے جواب دیا اور اپنی آنکھیں خشک کر کے رُسوئی گھر کی جانب چل پڑی رخسار نے جلیل سے وعدہ تو نہیں کیا تھا کہ وہ آئے گی لیکن انکی ہر بات گویا اسکے لئے حکم کا درجہ رکھتی تھی، وہ سوچنے لگی جائے یا نہ جائے، بہت سوچنے کے بعد یہ غلط کیا کہ چلی جائے، شام ہوتے ہی اس نے سعیدہ خاتون سے اجازت لی اور اپنی خالہ کے گھر چلی آئی، گھر میں بڑی گہما گہمی تھی اس نے اپنی خالہ شمیمہ خاتون کو سلام کیا تو وہ اسے دعائیں دیتی رہیں اس نے ریشماں کے بابت دریافت کیا تو انہوں نے کہا ”وہ جلیل کے کمرے میں ہے تم خود بھی وہیں چلی جاؤ۔“

رخسار سیدھے جلیل کے کمرے میں چلی آئی جہاں ریشماں جلیل کے لئے ہوئے تحفہ تحائف اور مختلف سامان علیحدہ کرنے میں مصروف تھی رخسار کو یوں سیدھا کمرے میں آتے دیکھا تو بڑی بوڑھیوں کی طرح ٹھوڑی پر دائیں ہاتھ کی انگلی رکھتے ہوئے کہنے لگی ”کیا زمانہ آگیا ہے موٹی آج کل کی لڑکیوں کی تو شرم و حیا ہی غارت ہو گئی ہے۔ دیکھو کس دندہ دلیری سے ایک نامحرم شخص کے کمرے میں گھسی چلی آ رہی ہے۔“ اسکے ہونٹوں پر شرارت مچل رہی تھی۔

رخسار بیک لخت پریشان ہو گئی کہ کہیں ریشماں کی بات کوئی سن نہ لے اس نے بھی اسے ڈانٹا کیا بکے جا رہی ہو، کچھ تو بڑے پھوٹوں کا لحاظ بر تو تمہیں پتہ ہے میں تمہاری بزدگ بننے جا رہی ہوں۔“

”کیا کہا میری بزدگ۔ ارے پھوٹ۔ میں تمہیں گھانس ڈالنے والی نہیں۔ ارے ڈرا کیا رحم کھا کر بھیا کو بلالیا تو ہماری بنو کے تیور ہی بدل گئے، کیسے اکڑ رہی ہے۔“ اس نے پھر چوٹ کی، ”کیا واقعی یہ تمہاری کارستانی ہے جو کہ جلیل اچانک ہی چلے آئے۔“ رخسار تعجب سے استفسار کرنے لگی۔

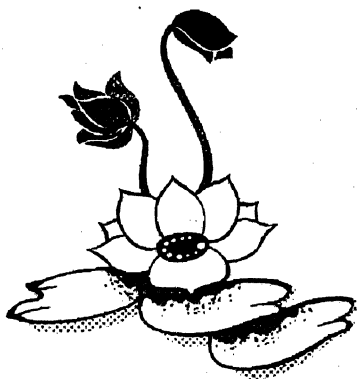
”پھر کیا کرتی۔ تمہاری ان بڑی بڑی غزالی آنکھوں میں تیرے موتی جیسے آنسو بھی تو دیکھے نہیں جاتے نا مجھ سے۔ تمہاری پریشانی دیکھ کر مجھے سی ایک سو جھا کہ بھیا کو ہی بلالیا جائے کیونکہ وہی تمہاری الجھن اور مسئلہ کا واحد حل ہیں۔ چنانچہ فون پر میں نے تمہاری الجھنوں کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ دیکھا رخسار بھیا تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔ فوراً کچے دھاگے سے بندھے چلے آئے۔“ ریشماں نے تفصیل بتائی اور کہا ”جاؤ اوپر ٹیرس پر وہ تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ تم جب تک وہاں رہو گی میں یہاں پہرہ دیتی رہو گی کہ کوئی اور اوپر نہ جانے پائے۔“

رخسار دبے قدموں اوپر چلی گئی جہاں جلیل ٹیرس والے کمرے میں اسکے منتظر بیٹھے تھے ان دونوں میں بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں کیا باتیں ہوئیں یہ تو وہی دونوں جالتے تھے۔

دوسرے دن شام میں ثمنہ خاتون سرخ رنگ پر چاندی کے تاروں سے نقش کیے گئے کشتی پوش سے ڈھکے تھال لینے اچانک ہی اپنی بہن سعیدہ خاتون کے گھر چلی آئیں۔ اس غیر متوقع آمد پر وہ پریشان ہو گئی لیکن مسکرا کر ان کا استقبال کیا اور پوچھ بیٹھیں ثمنہ یہ سب کچھ کیا ہے۔

آپا بیگم آپ پریشان نہ ہو۔ ابھی چند لمحوں بعد آپ جان جائیں گی کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ پھر ریشماں کو حکم دیا کہ وہ رخسار کو تیار کر لائے اور اپنے ساتھ لایا ہوا سرخ جوڑا اسے تمہا دیا۔ رخسار کو سرخ جوڑے میں سجا سنوار کر لایا گیا تو سعیدہ خاتون اسے اس طرح دلہن کے روپ میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں، انھیں یقین نہ ہو رہا تھا کہ یہ رخسار ہی ہے ان کی اپنی لخت جگر پھر سرخ تنگ جڑے انگوٹھی کو رخسار کی دائیں ہاتھ کی انگلی میں پنا کر ثمنہ خاتون نے جلیل کے لئے اسے اپنی بہو بنانے کا اعلان کر دیا تو اچانک ہی خوشی کے احساس کے زیر اثر سعیدہ خاتون کی آنکھیں اشکبار اور جبیں سجدہ ریز ہو گئی تاکہ اپنے مالک حقیقی کے حضور شکرانہ ادا کر سکیں۔

ثمینہ خاتون اور ریشماں جب لوٹ گئیں تو رخسار اپنے کمرے میں چلی آئی اسکی انگلی میں جلیں کی بھیجی ہوئی انگوٹھی جگمگا رہی تھی جس سے اسکی انمول محبت کی شعائیں پھوٹ پھوٹ کر اسکے دل کو منور کر رہی تھیں۔ دفعتاً اسکا ہاتھ اٹھا اور تشکر اور محبت کے جذبے کے تحت اس نے اپنے گلابی ہونٹ انگوٹھی پر رکھ دئے اور دل ہی دل میں خود سے کہنے لگی۔ ”جلیں ہمارے پاک جذبوں نے بالآخر جیت ہی لیا اور ہمارے بیچ یہ فاصلے سمٹ کر رہ گئے۔“





دونوں بہنوں کی عمروں میں صرف ڈیڑھ سال کا فرق تھا، اکثر ایسا ہوتا کہ ثمینہ کو دیکھنے کے بعد اگر کوئی شاہدہ کو دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ بڑی شاہدہ ہے، وہ تھی بھی بہت خوبصورت، بالکل صبح کا کھلا ہوا شگفتہ پھول، ثمینہ بھی پھول ہی تھی، لیکن ایسا پھول جو دن بھر دھوپ کی تپش سے مرجھا گیا ہو، اسی لئے ثمینہ کچھ احساس کمتری کا شکار بھی رہنے لگی تھی۔

دونوں بہنیں ایک ہی کالج میں پڑھتی تھیں، ثمینہ سائنس میں گریجویشن کر رہی تھی، اس کا یہ آخری سال تھا، شاہدہ بی۔ اے کے دوسرے سال کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھی، کالج میں فرصت کے لمحات میں سب لڑکیاں چمن کے ایک گوشہ پر قبضہ جمائے رہتیں، اور بات بڑھتے بڑھتے جب ثمینہ اور شاہدہ پر آرکتی تو اکثر لڑکیوں کا یہی خیال ہوتا کہ ثمینہ شاہدہ کی بہن ہرگز نہیں لگتی، کوئی لڑکی کبھی شاید شاہدہ کی کزن ہو، کوئی لڑکی فلسفیانہ انداز میں کہتی کہ کہاں شاہدہ اور کہاں وہ، دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے شاہدہ نکھری ہوئی صبح کے ماتد ہے تو وہ ڈھلتی ہوئی شام، ایسے موقعوں پر جب ثمینہ کی سماعت سے اس قسم کے فقرے ٹکراتے تو اسے خود پر قابو نہ رہتا، بے اختیار اس کی آنکھیں جل تھل ہو جاتیں۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا ثمینہ نے بی۔ ایس، سی کا امتحان پاس کیا ہی تھا کہ والدین نے اس کا رشتہ طے کر دیا، ثمینہ کو دیکھنے کیلئے جب اس کی سسرال کے لوگ آئے تو سارا کام شاہدہ کو ہی کرنا پڑا، اس نے بڑے سلیقہ سے بہن کو سنوارا اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی، وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئی، اس لئے کہ ثمینہ کو پہلی ہی نظر میں پسند کر لیا گیا۔ اس پر شاہدہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا، اسے ڈر

تھا کہ اگر ثمنہ ناپسند کی گئی تو اس کے احساسات پھر مجروح ہوں گے۔

آج جب دولہا بھائی کو دیکھنے کا دن آ گیا تھا تو شاہدہ ایسی بے چین تھی کہ کسی پل قرار ہی نہ تھا وہ سوچ رہی تھی کہ دولہا بھائی چاند جیسے ہونے چاہئیں اس نے بھی تصور میں خود اپنی زندگی کے ہم سفر کا خاکہ کھینچا تھا تو بھی اس کی یہی کوشش رہی تھی کہ وہ بہت خوب صورت ہو، بالکل پریوں کے دیس کا شہزادہ۔ اور آج جب ثمنہ کے دولہا کو بردکھائی کیلئے بلایا گیا تو شاہدہ بے چینی سے سارے گھر میں اودھم مچاتی پھرتی رہی اس نے ڈرائنگ روم کو سجا کر آئینہ بنا ڈالا۔ ایک کونے میں خوب صورت میز سجا کر دو ایک خوش رنگ گلدستے سجائے، قالین اور گاونگلیہ بچھا کر دولہا بھائی کے بیٹھنے کا انتظام کیا۔ دو ایک تازہ کیلنڈر دیوار پر آویزاں کر دئے جب وہ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ سے اچھی طرح مطمئن ہو گئی تو مہمانوں کی دعوت کا انتظام کرنے کیلئے اس نے باورچی خانے کا رخ کیا جب ساری تیاریاں ہو گئیں تو اس نے کچھ سکون کا سانس لیا اور مہمانوں کے انتظار میں گھڑیاں گننے لگی۔

خدا خدا کر کے دولہا میاں اپنے چند عزیزوں کے ہمراہ تشریف لائے ناصر واقعی دیکھنے میں مردانہ وجاہت کا شاہ کار تھا۔ شاہدہ نے پردے کی اوٹ سے جب اسے دیکھا تو اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ اٹکا۔ وہ خوشی میں جھومتی ہوئی ثمنہ سے جالپٹی "واقعی باجی قسمت ہو تو تمہاری جیسی ناصر بھائی اتنے اسمارٹ ہیں کہ تم ان کے پیروں کی دھول بھی نہیں۔ وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی پھر کچھ سنبھلی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ ایک طرح سے اس نے اپنی باجی کا مذاق اڑایا ہے۔ خفت مٹانے کے لئے اس نے اپنی بانہیں ثمنہ کے گلے میں ڈال دیں اور اس کی پیشانی کچھ اس انداز سے چوم لی کہ ثمنہ بڑی بہن ہوتے ہوئے بھی شرم سے سمٹ گئی اور اس نے مصنوعی غصے سے کہا "چل پگلی تجھے شرم آنی چاہئے اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے! لیکن دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی اور مستقبل کے سہانے خوابوں میں کھو گئی۔

ناصر تعلیم یافتہ نوجوان تھا اس نے سول انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کیا تھا اور اب پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں سپروائزر تھا، تنخواہ معقول تھی، اس لئے شہینہ کے والد اسلم صاحب نے اس رشتہ کو قبول کرنے میں کوئی جھجک نہیں دکھائی، پھر ایک مبارک دن منگنی کی رسم ادا کی گئی، شادی کی تاریخ چھ ماہ بعد طے پائی۔

اسلم صاحب کا خیال تھا کہ کوئی اچھا رشتہ شاہدہ کیلئے بھی آجائے تو دونوں لڑکیوں کے فرض سے سبکدوش ہو کر دیار حبیب کا رخ کریں گے کیوں کہ دو لڑکیوں کی شادیوں کے بعد ان پر بس فرید کی ذمہ داری رہ جاتی تھی جو ابھی چھوٹا تھا، اور دسویں کلاس میں پڑھتا تھا۔

شہینہ کی منگنی ہوئے دو مہینے ہو چکے تھے شادی کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں اسی درمیان اسلم صاحب کے ایک دوست کی وساطت سے ایک رشتہ شاہدہ کیلئے بھی آیا۔ لڑکا تعلیم یافتہ اور تجارت پیشہ تھا، صورت شکل معمولی سی تھی، لیکن نیک سیرت اور صحت مند تھا اسلم صاحب نے صورت پر سیرت کو ترجیح دی اور یہ رشتہ منظور کر لیا۔

شاہدہ نے اڑتی اڑتی یہ خبر ضرور سنی تھی کہ اس کے منگیترا کالے ہیں لیکن اسے یقین اس وقت ہوا جب منگنی کے دوسرے دن اس کی بے تکلف سیلی نازو نے کہا "شاہدہ تیرے سارے خواب بکھر گئے، سلیم ہرگز تیرے قابل نہیں تم دونوں کا کوئی میل ہی نہیں کھاتا، میری رائے میں تو اس رشتہ سے صاف انکار کر دے تو اس کے دل پر تیرا لگا۔ اے شہینہ پر رشک آنے لگا۔ احساس مایوسی سے اس کی پلکیں نم ہو گئیں، مگر اب ہو بھی کیا سکتا تھا منگنی ہو چکی تھی اور اس کی طرف سے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی، کیوں کہ جب اسلم صاحب نے اس کا عندیہ لیا تھا تو اس نے یہی سمجھ کر رضامندی دی تھی کہ ان کا انتخاب ناصر جیسا ہی ہوگا۔ باپ کی عزت کی خاطر اسے یہ غم برداشت کرنا ہی پڑا، مشرقی لڑکی جو ٹھہری، لیکن وہ بے چین ضرور تھی کہ کاش ایک بار وہ سلیم کو دیکھ سکتی۔

ایک مبارک دن دونوں بہنوں کی شادی ہو گئی، دوست احباب، عزیز واقارب، محلے والے سب ہی نے شرکت کی اور اسلم صاحب کو مبارک باد دی، دہنوں کو وداع کیا گیا میرا تیس ڈھولک پر گیت گانے لگیں ”چھوڑ بابل کا گھر آج پی کے نگر، جانا پڑا۔۔۔!“

ثمینہ سہانے خواب سجائے اپنی سسرال چلی گئی لیکن شاہدہ مایوس دل سے اپنی سسرال گئی، اسے آج رات پہلی بار سلیم سے سامنا کرنا تھا وہ سوچ رہی تھی کہ نہ جانے وہ کیسے ہوں گے ان کی صورت شکل، رنگ ڈھنگ، وہ برداشت بھی کر سکے گی یا نہیں چھوٹی موٹی رسموں کے بعد اسے جڑہ عروسی میں بٹھادیا گیا۔ اس نے گھونگھٹ کی اوٹ میں دیکھا، کمرہ بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا، سارے کمرے یں چتیلی کی کلیوں کی بھینی بھینی خوشبو مہک رہی تھی سلمے ہی دیوار پر سلیم کی تصویر خوبصورت کشتی نما فریم میں مسکرا رہی تھی، تصویر تھی تو خوبصورت لیکن اس کا دل مان نہیں رہا تھا، وہ بے چینی سے سلیم کا انتظار کرنے لگی۔

چند لمحے انتظار کی اذیت میں گزر گئے پھر دروازے پر آہٹ ہوئی اور سلیم شان بے نیازی سے کمرے میں داخل ہوا، چونکہ نسوانی شرم و حیا ملنہ تھی، اس لئے شاہدہ چاہتے ہوئے بھی گھونگھٹ ہٹا کر اسے نہ دیکھ سکی، بلکہ اس نے گھونگھٹ کھینچ کر کچھ اور گرا لیا سلیم آہستہ سے اس کے قریب آ بیٹھا، پھر اس نے سرخ نگ جڑی انگوٹھی اس کی نازک انگلی میں پہنادی اور دھیمی آواز میں کہا ”حضور، یہ چاند بادلوں میں کیوں چھپا ہوا ہے، ذرا اپنا گھونگھٹ ہٹا کر ہمیں اپنے چاند کا دیدار تو کر لینے دو۔“

وہ کچھ اور سمٹ گئی، کچھ لمحے انتظار میں گزر گئے پھر سلیم نے اس کا گھونگھٹ الٹ دیا دونوں کی نظروں کا تصادم ہوا اور دوسرے ہی لمحہ سلیم کی زبان سے بے ساختہ نکلا ”سبحان اللہ“ لیکن شاہدہ کے دل پر جیسے کسی نے گھونسا مارا ہو، وہ مضطرب ہو گئی، کیوں کہ سلیم واقعی اس کے خوابوں کا شہزادہ نہ تھا، وہ معمولی شکل و صورت کا تھا، شاہدہ کو ایسا لگا جیسے اسکے سارے خواب بکھرے پڑے ہیں، اور اس کی سیلیاں اس کا مذاق

اڑا رہی ہیں۔ سلیم نے بہت سی میٹھی میٹھی باتیں کیں مستقبل کے سہانے سینے دکھائے اور اسے بہت پیار کیا، لیکن وہ یہ سب کچھ بس برداشت کر گئی، اسے تو رہ رہ کر شینہ کا خیال آ رہا تھا کہ وہ ناصر بھیا کو پا کر کتنی خوش ہوگی، اسے رہ رہ کر گھر کی یاد ستانے لگی۔

شادی کے کوئی ایک ہفتے بعد اسے میکہ جانا تھا وہ ایک ایک گھڑی ایک ایک لمحہ گن گن کر گزار رہی تھی، وہ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد اپنے میکہ پہنچ کر شینہ کی خوشیوں کا اندازہ کرے گی، اس ایک ہفتے میں سلیم نے اس پر سب کچھ نچھاور کر دیا، لیکن اس کا کٹھنور دل نہ پگھلا۔

خدا خدا کر کے ایک ہفتہ گزر گیا اور شاہدہ میکہ کے جانے کے لئے تیار ہو گئی سلیم کچھ ضروری کام کی وجہ سے اس کے ہمراہ نہ جاسکا۔ اس لئے اسے اپنی چھوٹی تند کے ہمراہ جانا پڑا۔ وہ ایک طرح خوش بھی تھی کہ سلیم اس کے ساتھ نہ تھا، وہ سوچ رہی تھی کہ شینہ باجی کے ساتھ ناصر بھیا ضرور ہوں گے اور ناصر بھیا کے مقابل سلیم کو دیکھ کر کوئی کچھ کہہ بیٹھا تو خواہ مخواہ اس کی سبکی ہوگی، یہی سب کچھ سوچتے ہوئے جب وہ گھر پہنچی تو گھر میں خاموشی سی مسلط تھی، ہر طرف سوگواری کا عالم تھا، ہر فرد اپنی جگہ خاموش تھا جیسے گھر میں کوئی بہت بڑا حادثہ ہو گیا ہو۔

شاہدہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، اس نے ہر ایک سے استفسار کیا لیکن اسے خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ ملا پھر اس نے شینہ کے کمرے کا رخ کیا شینہ شاہدہ کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی ابل پڑے اب بھی شاہدہ کچھ سمجھ نہ سکی۔ اس کے پوچھنے پر شینہ نے اسے بتایا کہ اسلم صاحب اس معاملہ میں دھوکا کھا گئے ہیں، ناصر ایک ادارہ شخص ہی نہیں شادی شدہ بھی ہیں اور یہ ان کی دوسری شادی تھی، شاہدہ ایک طرف تو حیرت کے سمندر میں غوطہ کھانے لگی اور دوسری طرف اپنی معصوم بہن کی بربادی پر اس کا دل خون کے آنسو روئے لگا، یہ وقت میں اسے سلیم بے اختیار یاد آ گیا جس کے پیار کی اس نے قدر نہ کی تھی وہ خود کو

مجرم سمجھنے لگی، اور سسرال واپس لوٹنے کیلئے بے تاب ہو گئی، کیوں کہ گھر کا یہ گھٹا
گھٹا ماحول اسے پریشان کرنے لگا تھا۔

دو دن میکے میں بے چینی سے گزار کر جب شاہدہ سسرال پہنچی تو سلیم ابھی
ابھی کہیں باہر سے لوٹا تھا، ساس اور سسر سے مل کر وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی
کمرے میں داخل ہو گئی، سامنے ہی سلیم اس کا منتظر تھا، وہ ایک ٹک اسے گھورنے لگی،
جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو، آج سلیم اسے بے انتہا خوبصورت لگ رہا تھا، اپنے خوابوں
کے شہزادے سے بھی کہیں زیادہ وہ دوڑتی ہوئی بے خودی کے عالم میں سلیم کی بانہوں
میں جھول گئی، اس کے سینے سے لگی وہ سوچ رہی تھی کہ واقعی انسان کے چہرے میں اور
کردار میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے، اور پھر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔





”نعمان۔۔۔“ میری صلاح مانو اور یہ آگ سے کھیلنا چھوڑ دو۔ تم نہیں جانتے وہ لڑکی نہیں شعلہ ہے، جس کی تنپش سے کئی دل پگھل کر خاک نشیں ہو چکے ہیں، آخر تمہیں یہ کیا سوچھی کہ تم نے دل بھی لگایا تو کس سے، اس پتھر سے جس سے سوائے سر ٹکرائے اور زخمی ہونے کے اور کچھ حاصل نہیں، میری مانو تو اپنی زندگی کو یوں گھن نہ لگاؤ، اس سر پھری لڑکی سے باز ہی رہو تو سمجھو کہ خیریت ہے درنہ میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا بھی وہی حشر ہو گا جو اب تک کئی اور لڑکوں کا ہو چکا ہے۔“ نعمان کے دوست فرید نے اسے صلاح دی۔

کیا جکتے ہو یا۔۔۔؟ تم تو زے بزدل نکلتے، کیا تم نے سنا نہیں کہ محبت کی نہیں جاتی ہے بلکہ ہو جاتی ہے، کون کج بحث محبت کر رہا ہے، تم نہیں جانتے فرید میں نے تو اس پہلی نگاہ میں ہی اس پر اپنا سب کچھ نچا دیا ہے تم دیکھو گے کہ اگر میری محبت سچی اور پاک ہے اور جذبے پر خلوص دے لوٹ ہیں تو وہ ضرور میری محبت کا جواب محبت سے دے گی، آپ ہی آپ میری جانب بڑھے گی اور دوستی کا ہاتھ بڑھائے گی۔۔۔“ نعمان نے ایک عزم سے کہا۔ اگر تم ایسا محسوس کرتے ہو تو ٹھیک ہے، میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، اللہ تعالیٰ تمہیں کامیابی اور کامرانی عطا کرے، میں تو اپنے سابقہ مشاہدات کی روشنی میں تمہیں باخبر کر رہا تھا، کیونکہ تم میرے عزیز ترین دوست ہی نہیں خالہ زاد بھائی بھی ہو، اور ایک بھائی ہمیشہ اپنے بھائی کی بھلائی ہی چاہتا ہے، اسے غلط راستے پر جانے سے روکنے کی سعی کرتا ہے تو میں نے بھی وہی فرض نبھانے کی کوشش کی ہے، لیکن تمہارے عزم مصمم کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ تم واقعی کچھ کر گزرو گے۔۔۔“ فرید نے کہا۔

”ہاں بھائی میرے۔۔۔! میں چاہتا ہوں کہ شمع کو جو کہ شمع محفل بننے جا رہی ہے اسے شمع خانہ بناؤں، میں نے یوں محسوس کیا ہے کہ وہ اندر سے بہت ٹوٹی ہوئی ہے اور کچھ ایسے حالات سے گزری ہے جنہوں نے اسے اس راہ پر لا کھڑا کیا ہے، اسے کھینچنے نہ کوئی صدمہ یا غم ضرور ہوا ہے، اسی کے زیر اثر وہ اپنا رد عمل یوں ظاہر کرتی ہوگی، میں نے عزم کیا ہے کہ اس کے دل میں جھانکوں گا اور یہ کھوج نکالوں گا کہ اسے کیا غم ہے، کس چیز کا صدمہ ہے جو کہ وہ اندر ہی اندر بکھر رہی ہے، اور ہم مردوں سے بیزارگی کا اظہار جو کہ وہ کھلے عام کرتی نظر آتی ہے، کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی، جس نے اسے ہم مردوں سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا ہے، ہو سکتا ہے کوئی ایسا حادثہ ہوا ہو جو اس کے ذہن سے چمٹ کر رہ گیا ہو، نعمان نے یوں کہا جیسے وہ ایک ماہر نفسیات ہو۔

”ہاں ممکن ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ہو سکتا ہے کوئی ایسا واقعہ ہوا ہو جس کے صدمہ نے شمع کے ذہن پر اپنے منفی اثرات چھوڑے ہوں، جس کی وجہ سے اسے مردوں سے شدید نفرت ہو گئی ہو۔“ فرید نے بھی اس کے خیال کی تائید کی۔

ہوایوں کہ نعمان نے جب اپنے ایم، اے میں داخلے کے بعد پہلے دن یونیورسٹی میں قدم رکھا اور آرٹس کالج کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوا تو اس کی نگاہ سامنے سے آتی ہوئی شمع پر پڑی جو کہ اپنے ایک ہاتھ میں کتابیں لینے اور دوسرے میں گلابی ڈوپٹے کے آنچل کو مروڑتی ہوئی آرہی تھی۔ وہ دفعۃً رک گیا اور اس کی نگاہیں اس کے سراپے کا جائزہ لینے لگیں، واقعی وہ مشرقی حسن کا شاہکار لگ رہی تھی اور نچاقد نکھری نکھری سی گلابی رنگت ریٹیم جیسے بال جو کہ اس کی پشت پر لہرا رہے تھے، ہلکا ہلکا سا تبسم اس کے خوبصورت نرم و نازک ہونٹوں پر مچل رہا تھا، نعمان کو یوں لگا جیسے اس نے اپنے ہوش کھو دیئے ہوں، لیکن اس نے پھر اپنے سارے حواس مجتمع کیے اور آگے بڑھتے ہوئے بے جھجک اس سے مخاطب ہو گیا:

”ہیلو مس۔۔۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں ایم اے سال اول کی کلاسز کس کچن

ہال میں چل رہی ہیں۔۔۔؟“

نعمان کے اس طرز مخاطب پر وہ ششدر رہ گئی، کسی لڑکے میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اسے اس طرح مخاطب کرتا، وہ اسے تیز نظروں سے گھورتی ہوئی سوال کر بیٹھی:

”جناب کی تعریف۔۔۔ آپ یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے ہیں یا خوبصورت لڑکیوں پر خواہ مخواہ ہی فدا ہونے۔۔۔“

”مجھے نعمان احمد کہتے ہیں، ایم۔اے اکنائکس میں داخلہ لیا ہے، اور آج پہلا دن ہے، آپ یقین کریں میں یہاں صرف اور صرف حصول تعلیم کی غرض سے آیا ہوں، آج یونیورسٹی میں میں نے اپنا پہلا قدم ہی رکھا ہے اور پہلی نگاہ بھی پڑتی تو آپ پر، یوں سمجھئے کہ واقعی میں آپ پر فدا ہو گیا ہوں، اب اگر یہ نظریں کسی اور لڑکی پر پڑ جائیں تو اللہ کرے کہ اپنی بصارت ہی کھودیں۔۔۔“ نعمان نے کہا اور مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا کیوں کہ وہ خود میں اس شعلہ بارنگاہوں کی تاب لانے کی ہمت نہ پا رہا تھا۔

نعمان تو آگے بڑھ گیا تھا لیکن شمع کی تیز لگاہیں اس کا تعاقب تب تک کرتی رہیں جب تک کہ وہ اس کی نگاہوں سے ادجھل نہ ہو گیا، پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی گئی اور اس نے جیسے خود سے کہا: ”مسٹر نعمان۔۔۔ دیکھتی ہوں کہ تمہاری پرواز کہاں تک ہے، پرکٹے پتھری کی طرح تمہارے پر بھی کاٹ ڈالے جائیں گے، پھر زمانہ دیکھے گا کہ تم کیسے اڑتے ہو۔!“ یہ تھی ان کی پہلی ملاقات۔۔۔

کالج کے بعد آج جب وہ گھر پہنچی تو نجانے کیوں نعمان کا سراپا اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا، اس کا مضبوط کسرتی جسم، چوڑا چکلا سینہ کھلتے ہوئے رنگ پر ہلکی ہلکی تراشیدہ مونچھیں بہت خوبصورت لگ رہی تھیں، بہت ہی صاف ستھرا لباس اس نے زیب تن کیا ہوا تھا، کالی پتلون پر نیلے رنگ کی دھاری دار بشرٹ میں وہ مردانہ وجاہت کا واقعی شاہکار لگ رہا تھا، اس سے بڑھیر کے بعد جب وہ آگے بڑھ گیا تھا تو نہ چلہتے ہوئے بھی وہ اسے بہت دور تک دیکھتی رہی تھی، اس نے محسوس کیا تھا کہ آج وہ پہلی بار کسی لڑکے سے اس طرح متاثر ہوئی تھی، کسی لڑکے کے سحر میں اس طرح کھوئی تھی۔

کسی نے پہلی بار اسے مثبت انداز میں سوچنے پر مجبور کیا تھا، نجانے کیوں اس کے تصور میں بار بار نعمان کا سہرا پا چھانے لگا تھا، باوجود نفرت کے احساس کے وہ اس کے تصور سے پیچھا چھڑانے میں ناکام ہو رہی تھی، سعی مسلسل کے باوجود وہ ناکام رہی تھی اور نعمان کا مسکراتا ہوا چہرہ اسے چڑا رہا تھا، ایک آواز اس کے اندر کہیں سے گونج بن کر اس کے وجود کو جھنجھوڑ رہی تھی۔

”بڑی مغرور بنتی تھیں نا تم، کہاں گیا تمہارا وہ سارا غرور تم نے تو ہر بار اپنی مخالف جنس کو اپنی ٹھوکروں میں رکھا تھا ہر ایک سے کھلواڑ کرتی رہی تھیں، لڑکوں کو اپنی جانب راغب کرتیں اور پھر انہیں ایسا دھتکار تیں کہ وہ کہیں کہ نہ رہ پاتے، پھر دل ہی دل میں ان کی بربادی پر خوش ہوتیں، اپنی سیلیوں کے ساتھ مل کر جشن مناتیں، لیکن آج تمہیں یہ کیا ہو گیا کہ تم اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود کسی کو اپنے تصور سے بھی نہ جھٹک پا رہی ہو، یہ کیسا انقلاب بپا ہو گیا ہے تم میں کہ کسی نے پہلی ہی ملاقات میں تمہیں غرور کی بلند چوٹی سے اس طرح پھینکا کہ زمین پر تم چاروں خانے چت گر پڑیں، کہاں گئے وہ تمہارے بلند بانگ دعوے، کہاں گئیں وہ تمہاری قسمیں جو تم نے اپنے دوستوں سے کھائی تھیں اور کہا تھا کہ تمہیں مرد ذات سے بیر ہے، دشمنی ہے نفرت ہے، ازل سے ابد تک تم ان سے نفرت کرتی رہو گی، لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ تم ایک معمولی لڑکے کے آگے جھک گئی ہو، تمہارا وہ مغرور وجود لوٹ کر پاش پاش ہو گیا ہو بکھرنے لگا ہو، شمع یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔؟

”ہوں۔۔۔!“ اس نے ہنکارا بھرا۔۔۔ شمع کبھی کسی کے آگے جھکی ہے جو اس معمولی سے لڑکے کے آگے جھک جائے گی۔۔۔“ اس نے جیسے خود سے کہا اور اپنے ذہن سے چپکے ہوئے نعمان کے وجود کو جیسے ایک ہی جھٹکے میں نکال پھینکا ہو، پھر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی، کتابیں میز پر رکھ کر بستر پر دراز ہو کر سستانے لگی، ابھی اسے لیٹے ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ ننھی ندا جو اس کی جان تھی کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے گول مول چہرے کو مٹکاتے ہوئے کہنے لگی۔

پھوپھی جان۔۔۔! آپ کو می بلارہی ہیں۔! جلدی چلے۔۔۔!“ پھر اس نے اپنی ننھی بانہیں اس کے گلے میں حائل کر دیئے۔۔

ندا بیٹی۔۔۔ تم چلو میں ابھی کپڑے بدل کر آتی ہوں، اس نے ننھی ندا کے نرم نرم گالوں پر پیار کر کے اسے واپس بھیجا اور خود کپڑے تبدیل کرنے لگی۔۔

کھنکھناتی بھابی جان! کیا حکم ہے بندی حاضر ہے۔“ اس نے باہر آکر بھابی جان سے کہا۔۔۔

”کچھ نہیں شمع۔۔۔ میری طبیعت کچھ مضطرب سی ہے سوچا کہ گرم گرم چائے کیوں نہ پی لی جائے، تمہارا کیا خیال ہے، دو پیالی چائے بنالاء۔۔۔ بھابی نے کہا۔

”بہت نیک خیال ہے، ابھی بنا کر لاتی ہوں۔۔۔!“ کھنکھناتی وہ باورچی خانے کی جانب چلی گئی، تھوڑی دیر بعد وہ چائے کی ٹرے لیے حاضر ہو گئی، پیالیوں سے گرم گرم بھانپ اٹھ رہی تھی، دونوں تند بھانج چائے پینے لگیں، چائے سپ کرتے ہوئے رعنا بھابی نے پوچھا۔

”کھو شمع۔۔۔ تمہاری تعلیم کیسی چل رہی ہے، یہ تمہارا آخری سال ہے، تمہاری صند کے آگے تمہارے بھیا نے تمہیں ایم، اے کرنے کی اجازت دی تھی، ورنہ ہمارا خیال تھا کہ تمہاری شادی کر دیں، اب تم ایم، اے کی تکمیل کر لو تو پھر تمہاری شادی کے بارے میں سوچیں گے۔“

”بھابی جان۔۔۔! یہ آپ دونوں ہر وقت میری شادی کے بارے میں کیوں سوچا کرتے ہیں، جب کہ میں نے آپ لوگوں سے کہہ دیا کہ میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے، اور جب کبھی ہو گا تو میں آپ کو بتا دوں گی شمع نے بہت ہی معجزانہ انداز میں کہا:

”لیکن بنو۔۔۔ تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ تم ایک لڑکی ہو اور ہر لڑکی کو ایک نہ ایک دن باہل کا گھر چھوڑ اپنے پیارے کا دیس بسانا ہی پڑتا ہے، یہی رواج ہے، یہی ہمارا معاشرہ، ہمارا سماجی اصول و ضابطہ ہے جس سے انحراف کوئی نہیں کر سکتا۔ میری پیاری تند جی تمہیں بھی ایک نہ ایک دن اپنے پیارے کے دیس جانا ہی ہو گا، تم تو شمع ہو، کیا تم یہ نہیں

الرحیم سے ۱۰ اور لڑکوں کو شعر پڑھنا تھا حرف "م" سے :

لڑکوں کے گروپ سے آصف اقبال نے کھڑے ہو کر شعر پڑھا :

مجھ کو غم حالات کی تصویر سمجھنا

اس خط کو میری آخری تحریر سمجھنا

اب باری تھی لڑکیوں کے گروپ کی ۱۰ انھیں "الف" سے شعر پڑھنا تھا کچھ لمحے یوں

بی بیت گئے پھر شمع اپنی نشست سے اٹھی اور شعر پڑھنا شروع کیا :

آج لکھنی ہے غم دل کی حکایت صابر

بجھ گئی شمع تو زخموں کے اجالے ہی سی

اس شعر پر سامعین نے دل کھول کر داد دی سارا بال تالیوں سے گونج اٹھا ۱۰ اب

لڑکوں کو "یے" سے شعر پڑھنا تھا ۱۰ اس بار نعمان اٹھا اور شعر پڑھنے لگا کہ :

یاد رکھو تو دل کے پاس میں ہم

بھول جاؤ تو فاصلے ہیں بہت

نعمان کے اس شعر پر بھی خوب داد ملی ۱۰ ایک بار پھر تالیوں کا شور ہو رہا تھا ۱۰ اب

لڑکیوں کے گروپ کو حرف "ت" سے شعر پڑھنا تھا ۱۰ اس بار چند لمحے یوں ہی بیت گئے .

لگتا تھا اس حرف سے شروع ہونے والا کوئی شعر لڑکیوں کو یاد نہ آ رہا تھا ۱۰ دفعہ تا پھر شمع اٹھی

اور شعر کا پہلا مصرعہ پڑھنا شروع کیا :

تری نگاہ نے کیا کہہ دیا خدا جانے

مصرعہ اولی اس نے دو تین بار پڑھا لیکن وہ شعر مکمل نہیں کر پاری تھی ۱۰ غالباً

مصرعہ ثانی وہ بھول گئی تھی پھر جس نے گھنٹی بجادی جس کا مطلب تھا کہ اب لڑکوں کے

گروپ کو شعر مکمل کرنے کا موقع دیا جاتا ہے ۱۰ اسی وقت نعمان پھر اپنی نشست سے اٹھا اور

اس شعر کو یوں مکمل کر دیا کہ :

تری نگاہ نے کیا کہہ دیا خدا جانے

بجائے شمع مرے پاس آئے پروانے

چاہو گی کہ اپنے پیہ کی اندھیر نگری کو اپنی محبت کی روشنی سے جگمگاٹ عطا ہو۔۔۔ ”رعنا بھابی نے بڑے پیار سے اسے سمجھایا۔

”بھابی جان۔۔۔ ایک بات صاف صاف بتائیں، کیا میں آپ لوگوں پر اتنی بوجھ بن گئی ہوں کہ آپ لوگ ہر پل ہر لمحہ میری شادی کے بارے میں ہی سوچا کرتے ہیں، اگر ایسا ہے تو یقیناً آپ لوگ اسی بوجھ کو جلد از جلد اپنے کندھوں سے اتار پھینکیں مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا، اور اگر ایسا نہیں ہے تو میں آپ سے التماس کرتی ہوں کہ جب تک میں نہ چاہوں اس بارے میں سوچنے کا بھی نہیں، ”اتنا کہتے کہتے اس کی پلکوں پر شبہی ستارے جھلملانے لگے، اس کی آواز بھی بھیگ چلی تھی۔ دفعتاً اس کے تصور میں اس کی مرحوم ماں کا وہ سما سما دجوا بھرنے لگا جو اس کے ابو کے جبر و تشدد کا ہر وقت نشانہ بنتی رہتی تھیں اور ہر بار خاموشی سے ان کے ہر ظلم سہا کرتی تھیں، وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنی چپیتی بھابی کی گود میں معصوم بچی کی طرح سر رکھے بلک پڑی:

”نہیں بھابی جان نہیں۔۔۔ مجھے کبھی شادی نہیں کرنی ہے۔۔۔ آپ لوگ مجھے مجبور نہ کریں۔۔۔“ ارے ارے۔۔۔ شمع تم تو رونے لگیں ہم نے سنا ہے کہ تم تو ایک بہادر قسم کی لڑکی ہو، یہ تم کمزور و بزدلوں کی طرح آنسو بہانے لگ گئیں، اچھا بابا ٹھیک ہے اگر تم شادی نہیں کرنا چاہتی تو نہ سہی، تمہاری جب مرضی ہوگی بتا دینا مگر اب اچھے بچوں کی طرح خاموش ہو جاؤ۔ ”رعنا بھابی اس کے نرم و گداز بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھا کرتی ہوئیں اسے سمجھانے لگیں پھر اسے اٹھا کر اپنے ہمراہ واش بین تک لے آئیں اور بھبا:

”منہ ہاتھ دھو لو، شام کا کھانا ہم دونوں مل کر بنائیں گے آج تمہاری پسند کی ڈش بنے گی۔۔۔“ بھابی نے کہا تو وہ آہستہ آہستہ منہ ہاتھ دھونے لگی۔

آج یونیورسٹی میں بیت بازی کا مقابلہ تھا، یہ مقابلہ سال اول اور سال آخر کے طلباء و طالبات کے درمیان ہو رہا تھا، دونوں گروپس لکچر ہال میں جمع تھے، جس کے فرائض ہیڈ آف دی اردو ڈیپارٹمنٹ فاروقی صاحب اور پروفیسر ثمینہ یزدانی انجام دے رہے تھے، مقابلہ کا آغاز ہوا اور لڑکیوں کے گروپ سے سعیدہ نے شروعات کی بسم اللہ الرحمن

جیسے ہی نعمان نے گرہ لگائی، سارا ہال پھر ایک بار تالیوں اور قہقہوں کی ملی جلی آواز سے گونج اٹھا، لڑکوں کے گروپس ونس مور ونس مور کی فرمائش کرنے لگے اور لڑکیاں کھیانی سی ہو کر ایک دوسرے کے چہرے تکتے لگیں:

اسی طرح یہ مقابلہ چلتا رہا، لڑکوں کے گروپ کے پوائنٹس آہستہ آہستہ بڑھنے لگے، آخر کار لڑکوں کے گروپ کو فاتح قرار دیا گیا۔ آج ایک بار پھر نعمان نے اسے مات دے دی تھی اور وہ بارے ہوئے جواری کی طرح اپنی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ چہرہ لٹکائے ہال سے باہر نکل رہی تھی۔۔۔

”انیل کچھ سنا تم نے۔۔۔؟“ ساجد نے انیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، وہ چاروں یونیورسٹی کینٹین کی ایک میز پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے، انیل، ساجد، کشور اور واصف چائے پیتے ہوئے گفتگو میں منہمک تھے۔۔۔

”کیا سنا بھائی ساجد۔۔۔؟ صاف صاف کہو نا یا بات کیا ہے۔۔۔؟“ انیل سگریٹ جلاتے ہوئے پوچھنے لگا۔۔۔

”ارے یار ونی چمکتی بلبل، ان دنوں کچھ خاموش خاموش سی رہنے لگی ہے، لگتا ہے کسی نے اس پر تھردل کو بالاغر پگھلا ہی دیا۔۔۔“ ساجد نے پھر پہیلی میں بات کی۔

”کس بلبل کی بات کر رہے ہو یار۔۔۔؟ کہیں تم شمع کے بارے میں تو نہیں کہہ رہے ہو۔۔۔؟“ انیل نے سگریٹ کا دھواں فضا میں اچھالتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں یار وہی شمع جس نے ہم پروانوں کو باری باری جلا کر راکھ کر ڈالا، اور اب لگتا ہے کسی نے اس شمع کو بالآخر موم کے سینے میں دھاگہ بن کر جلنے پر مجبور کر دیا ہے، کسی نے اپنی محبت سے اسے تسخیر کر ہی لیا ہے۔۔۔“ ساجد نے کہا تو کشور درمیان ہی میں بول اٹھا:

”نہیں یار ایسا ہو ہی نہیں سکتا، وہ ایک انتہائی مغرور اور بد تمیز لڑکی ہے، کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ اس گھمنڈی کو ایسا سبق سکھاؤں کہ ساری عمر روتے گزر جائے۔ تم سب دیکھنا ایک نہ ایک دن میں ضرور اس کا سارا غرور خاک میں ملا دوں گا۔۔۔“ وہ

اپنے داہنے ہاتھ کی مٹھی بنا کر میز پر مارتے ہوئے کھنے لگا۔

وہ چاروں اسی سے متعلق گفتگو میں مصروف تھے کہ دفعتاً لڑکیوں کا ایک گروپ کینٹین میں داخل ہوا۔

صدف شیدا، شمع اور شوبھا کینٹین میں داخل ہوئیں۔ غالباً شمع کی شامت ہی نے ان لڑکیوں کے ہمراہ وہاں کینٹین میں آنے پر مجبور کیا تھا، ان چاروں نے جیسے ہی ایک خالی میز کی جانب بڑھنا چاہا، کشور بول پڑا:

”یہ شمع آج ادھر کیسے جل اٹھی، بہت تڑپا دیا ہے تم نے ہمیں لیکن یاد رکھنا ایک دن تم بھی سرخ بہسل کی طرح تڑپو گی، ہمیں وقت کا انتظار ہے سمجھیں تم۔۔۔“ وہ ابھی اپنی بات ختم نہ کر پایا تھا کہ ایک گرجدار آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”لیکن مسٹر کشور۔۔۔ مجھے وقت کا قطعی انتظار نہیں اگر بھلائی چاہتے ہو تو محترم شمع۔۔۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔۔۔“

یہ آواز کسی اور کی نہیں نعمان کی تھی، اس کے ساتھ اس کے دوست فرید اور شارق بھی تھے، پھر نعمان آگے بڑھا اور کہنے لگا۔

”لڑکیوں سے بات کرنے کی تمیز سیکھو مسٹر۔۔۔“ ابھی نعمان نے اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ وہ چاروں اسے خوشخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کینٹین کے باہر چلے گئے، جاتے جاتے کشور نے کہا۔

”مسٹر نعمان۔۔۔ تم نے ہم سے ٹکرا کر اچھا نہیں کیا، بہت پچھتاؤ گے۔۔۔“

تب نعمان نے ان چاروں لڑکیوں کو مخاطب کر کے کہا ان ادارہ لڑکوں کے منہ نہ لگئے، آئندہ سے احتیاط برتے گا۔۔۔ پھر وہ اور اس کے دوست کینٹین سے باہر چلے گئے، شمع اور اس کی ساتھی لڑکیاں دم بخود انھیں جاتا ہوا دیکھتی رہیں، پھر وہ چاروں بھی وہاں سے چلی آئیں، صدف نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا ”اگر نعمان وہاں نہ آتے تو نجانے آج کیا ہو جاتا، فرشتہ بن کر عین وقت پر آ پہنچے میری توجہ ان ہی نکلی جا رہی تھی۔۔۔“

”ہاں صدف تم ٹھیک کہہ رہی ہو“ شیدا اور شو بھانے ایک آواز ہو کر کہا تو شمع بھی ان کی رائے سے اختلاف نہ کر سکی، پھر کچھ لمحے سوچتی رہی اور کہا ”نجانے انھیں کیسے پتہ چلا کہ ہم لوگ کینٹین میں ہیں اور ان چار آوارہ لڑکوں کے بیچ پھنسنے جا رہی ہیں“ تم نے سنا نہیں شمع کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے تم چاہے کتنا ہی انکار کرتی رہا کرو لیکن ہم جلتے ہیں کہ تمہارے دل میں نعمان صاحب کیلئے نرم گوشے بنتے جا رہے ہیں۔ بالآخر انہوں نے تمہیں تسخیر کر ہی لیا۔ ان کی محبت کی گرمی سے تم آہستہ آہستہ موم کی طرح ضرور پگھلتی جا رہی ہو۔۔۔“ صدف نے شمع کو چھڑتے ہوئے کہا تو وہ سوائے خاموشی کے کوئی اور رد عمل ظاہر نہ کر سکی لیکن اس کے خوب صورت ہونٹوں پر دل نواز تبسم پھیلتا چلا گیا۔۔۔

پھر ہوا یوں کہ نعمان مسلسل کئی دنوں تک یونیورسٹی سے غیر حاضر رہا، اس کی غیر حاضری کی کیا وجہ ہو سکتی ہے کسی کو معلوم نہ ہو سکا، عجیب و غریب قسم کے دوسوے شمع کو گھیرے رہے، اس کے ذہن میں ایک خیال یہ بھی آنے لگا کہ کہیں کشور اور اس کے ساتھیوں نے مل کر ان سے کینٹین والے واقعہ کا بدلہ نہ لے لیا ہو، اس خیال کے آتے ہی وہ بے چین ہو جاتی، اس کی نگاہیں ہر روز متلاشی رہتیں لیکن وہ کہیں نظر نہ آتا۔ اپنی اس دلی کیفیت کا اظہار جب اس نے صدف سے کیا تو وہ کہنے لگی، تم یہیں ٹھہرو میں ابھی پتہ کیے دیتی ہوں۔۔۔“ پھر وہ شعبہ اکناکس کی جانب بڑھتی چلی گئی، اور لکچر ہال تک پہنچی ہی تھی کہ ہال سے باہر آتے ہوئے فرید سے اس کی مڈ بھڑ ہو گئی، اس نے اسے سلام کیا تو فرید جواب دیتا ہوا سوال کر بیٹھا ”کہنے کیسے یاد آگئی ہماری۔۔۔؟“

”دراصل بہت دنوں سے نعمان صاحب نظر نہیں آئے تو سوچا کہ آپ سے ان کی خیریت دریافت کر لوں۔۔۔“ صدف نے کہا۔۔۔

”آپ لوگ کیسے اس بات سے لاعلم رہ گئیں۔۔۔ وہ بے چارہ بیمار پڑ گیا ہے فلو ہو گیا تھا اسے، بہت تیز بخار تھا اسے میں کل شام ہی مل آیا ہوں اس سے، ویسے اب بخار تو نارمل ہو گیا ہے، لیکن کمزوری بہت ہو گئی ہے، ڈاکٹر نے اسے کم از کم دو ہفتے آرام لینے کی ہدایت کی ہے“ فرید نے نعمان کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا۔

”ہم لوگ واقعی لاعلم رہیں ان دنوں، آپ سے بھی ملاقات نہ ہو سکی، خیر۔۔۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہمیں ان کے گھر کا ایڈریس دیجئے گا۔“ صدف نے پوچھا تو فرید اسے نعمان کے گھر کا پتہ سمجھانے لگا، پھر وہ اس کا شکریہ ادا کر کے چلی آئی شمع کو وہ جہاں چھوڑ گئی تھی اسے وہیں اپنا منتظر پایا تو وہاں آکر اس نے نعمان کی بیماری کے بارے میں اسے آگاہ کیا اور پھر اسے یہ بھی بتایا کہ وہ اس کے گھر کا پتہ فرید سے معلوم کر کے آرہی ہے۔ پھر ان دونوں نے طے کیا کہ کلاسز ختم ہونے پر وہ دونوں آج شام نعمان کے گھر ان کی مزاج پر سی کو ضرور جائیں گی۔

کلاسز ختم ہونے پر شمع اور صدف دونوں نے آٹور کشا پکڑا اور سیدھا بشیر باغ چلی آئیں، جب آٹور کشا نعمان کے گھر کے آگے رکھا تو گیٹ پر ٹھہرے باوردی ملازم نے آگے بڑھ کر انھیں سلام کیا اور باادب ہو کر پوچھا ”بنی بی صاحبہ کس سے ملنا ہے آپ لوگوں کو۔۔۔؟“

”ہم دونوں یونیورسٹی سے آرہی ہیں، نعمان صاحب سے کہو کہ صدف اور شمع ان سے ملنا چاہتی ہیں۔۔۔“ ان کے اتنا کہتے ہی وہ گیٹ کھول کر انھیں اندر آنے کیلئے کہہ کر خود صدر روازے سے اندر داخل ہو گیا، کچھ لمحے انھیں انتظار کرنا پڑا پھر وہ واپس لوٹ آیا اور ان دونوں کو اپنے ہمراہ ڈرائنگ روم تک لے گیا، انھیں وہاں بٹھا کر خود واپس باہر چلا گیا۔ صدف اور شمع دونوں خوبصورت صوف پر بیٹھیں ڈرائنگ روم کی سجاوٹ کا جائزہ لے رہی تھیں، مکان کیا تھا پرانی طرز پر تعمیر شدہ خوبصورت کوٹھی تھی، لیکن متواتر دیکھ بھال کے باعث کسی بھی نو تعمیر شدہ عمارت سے کم نہ تھی، اندرونی دیواروں پر خوبصورت پیل بوئے بنائے گئے تھے جنھیں وال پینٹ سے مزین کیا گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں دلکش سینیری آویزاں تھی اور ایک کونے میں خوش رنگ پھولوں سے سجا گلدستہ کرسٹل ٹیبل پر سجایا ہوا تھا۔۔۔۔۔

ڈرائنگ روم کی سجاوٹ ہی سے مکینوں کے ذوق اور نفاست پسندی کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ وہ دونوں ایک ایک چیز کا بغور جائزہ لے رہی تھیں کہ دفعتاً ایک درمیانہ عمر

کی خاتون داخل ہوئیں، ان کے آتے ہی وہ دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں اور باادب ہو کر انھیں سلام کیا۔

”جیتی رہو، لمبی عمر پاؤ۔۔۔“ انھوں نے جواب میں انھیں دعاؤں سے نوازا۔ پھر کہنے لگیں، ”تم دونوں اپنا اپنا تعارف دو مجھے۔۔۔؟“

”جی آئی۔۔۔ یہ شمع ہے اور میں صدف ریاض، ہم دونوں بھی ایم اے کر رہی ہیں۔“ نعمان صاحب سے ایک سال آگے ہیں، اور ان کی بہت اچھی دوست بھی، ”اس درمیان شمع خاموش بیٹھی ان کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی جس پر نور ہی نور پھیلنا تھا محبت اور شفقت ان کی آنکھوں سے جھلکتی جا رہی تھی۔

”شمع بیٹی۔۔۔ تم خاموش کیوں ہو؟ ذرا تفصیلی طور پر مجھے بتاؤ کہ کہاں رہتی ہو، تمہارے والدین کون ہیں کیا کرتے ہیں؟ گھر میں اور کون کون رہتا ہے۔۔۔؟“ پھر کچھ دیر رک کر کہا، ”میں نعمان کی ماں ہوں، وہ ابھی نیچے آتا ہی ہو گا، دراصل بخار نے اسے بے حد کمزور کر دیا ہے، بہت تیز بخار رہا تھا اسے۔۔۔“ نعمان کی امی رضیہ خاتون انھیں بتاتے لگیں:

”میں عابد حسین اور صالحہ بیگم کی بیٹی ہوں، مجھ سے بڑی ایک بہن ہیں نانکہ باجی، جن کی شادی ہو چکی ہے، بڑے بھائی زاہد حسین ہیں جو کہ یہاں حیدر آباد ابن ڈیولپمنٹ اتھارٹی میں آفیسر ہیں، ان کی بھی شادی ہو چکی ہے امی کا انتقال ہو گیا ہے اور ابو ہم سے علیحدہ اپنی دوسری بیوی کے ساتھ بنگلور میں رہتے ہیں میں بھی اور بھابی کے زیر سرپرستی میں رہتی ہوں۔۔۔“ شمع نے تفصیلی طور پر اپنا تعارف دے ڈالا۔۔۔

”اور تمہاری ننھیال۔۔۔؟“ انھوں نے سوالیہ انداز میں کہا پھر کسی سوچ میں گم ہو گئیں، پھر خود ہی کہنے لگیں، ”کبھی تم عائشہ خانم اور ڈاکر چچا کی نواسی تو نہیں ہو جو ریڈ بلز میں رہتے ہیں اور اپنے وقت کے مشہور استاد رہ چکے ہیں۔۔۔؟“

”ہاں آئی۔۔۔ آپ درست فرما رہی ہیں، میں ان ہی کی نواسی ہوں، ماننا حضرت تو نہیں رہے لیکن ثانی جان ابھی بقیہ حیات ہیں۔ لیکن آپ انھیں کیسے جانتی ہیں۔۔۔؟“

شمع نے جیسے ہی کہا وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور اپنی دونوں بانہیں پھیلا دیں اور کہا ”شمع بیٹی۔ تم اتنی دور کیوں بیٹھی ہو، آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ۔ تم تو میری سب سے پیاری دوست صالحہ مرحومہ کی نعت جگر ہو۔“ اتنا سنتے ہی شمع اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے سینے سے جا لگی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

”بڑی بد نصیب تھی وہ۔ ساری عمر مرمر کر گیا اس نے گویا زندگی سے جنگ لڑتی رہی، بالآخر بازی ہار دی اور اپنی جان دے ہی دی۔“ رضیہ خاتون نے کہا اور اپنی آنکھوں کی نمی خشک کرنے لگی۔

”ہاں آئی۔۔۔ بہت دکھ جھیلے تھے امی نے کبھی سکھ کی سانس نہ لے سکیں۔ ساری عمر آنسو ہی بہاتی رہیں، میں نے جب سے ہوش سنبھالا انھیں ہنستا ہوا کبھی نہ دیکھا،“ آنسوؤں کی لڑیوں کے بیچ وہ انھیں بتانے لگی۔

”بس کرو بیٹی۔۔۔ صبر کرو، میں تمہاری ماں کی زندگی سے بہت اچھی طرح واقف ہوں، ہم دونوں ہم جماعت تھیں، ہماری شادی بھی تقریباً ایک ساتھ ہی ہوئی تھی، چند ہی دنوں کے فرق سے، پھر وہ تمہارے ابو کے ساتھ حیدر آباد سے باہر نکلیں چلی گئیں، اس کے بعد ہماری ملاقات نہ ہو سکی، لیکن میری دوسری ساتھیوں کے زبانی اس کے حالات مجھے معلوم ہوتے رہے۔۔۔“ رضیہ خاتون انھیں بتانے لگیں۔ نعمان جب داخل ہوا تو وہ اسے بٹھا کر خود اندر چلی گئیں۔

”کیسی طبیعت ہے آپ کی اب۔ ہمیں آج ہی فرید صاحب کے ذریعہ معلوم ہوا کہ آپ فلو کا شکار ہو گئے تھے۔۔۔“ صدف نے پوچھا۔ شمع خاموش بیٹھی نعمان کو دیکھے جا رہی تھی جو کچھ کمزور کمزور سالگ رہا تھا۔۔۔ چہرے سے نقاہت ٹپک رہی تھی۔۔۔

”بخار تو خیر اللہ کے فضل و کرم سے نارمل ہو گیا ہے لیکن کمزوری محسوس کر رہا ہوں، سارا جسم ٹوٹنے لگا تھا، ایک آدھ ہفتہ بعد ہی غالباً یونیورسٹی آنے کے قابل ہو سکوں گا۔۔۔“ نعمان نے کہا۔

”سنا ہے ڈاکٹر نے دو ہفتہ کا آرام تجویز کیا ہے“ اس بار شمع بولی

”آپ کی حالت خود بتا رہی ہے کہ آپ کو زیادہ آرام کی ضرورت ہے میں تو یہی کہوں گی کہ مکمل صحت جب تک نہ ہو جائے آپ یونیورسٹی آنے کے بارے میں سوچنے کا بھی نہیں۔“ شمع نے اپنائیت بھرے لہجے میں زور دے کر کہا۔

”ٹھیک ہے آپ کے اس مخلصانہ مشورہ پر ضرور عمل کروں گا۔ پھر آپ دونوں نے یہاں میرے گھر تک آکر میری مزاج پر سی کی ہے، اپنے پیار، اپنے خلوص اور اپنائیت کا مظاہرہ جو کیا ہے اس کیلئے میں آپ دونوں کا مشکور ہوں۔“ نعمان نے مسکراتے ہوئے کہا تو شمع فوراً بول پڑی۔

”اس میں شکریہ ادا کرنے والی کیا بات ہے، یہ تو ہمارا فرض تھا جو کہ ہم نے نبھانے کی ایک چھوٹی سی کوشش کی ہے۔“

”اور پھر شمع آپ کی غیر حاضری سے پریشان اور متفکر بھی تھی، عجیب و غریب دوسوے اے گھیرے ہوئے تھے۔“ صدف معنی خیز مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر بجا کر ان دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”کیا واقعی۔۔۔ یہ میں اپنے لیے خوشیوں کی سوغات سمجھوں گا۔۔۔!“ نعمان نے سوالیہ نگاہیں شمع پر مرکوز کرتے ہوئے پوچھا تو ایک تھینی تھینی سی مسکراہٹ شمع کے چہرے پر پھیلتی چلی گئی۔

رضیہ خاتون اپنے ہمراہ ملازمہ بوا کو لیے جو کہ چائے کی کشتی اور لوازمات تھامے ہوئی تھیں ڈرائیگ روم میں داخل ہوئیں۔ ملازمہ بوا جب تمام چیزیں میز پر بجا کر چلی گئیں تو رضیہ خاتون نے صدف اور شمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”لو بیٹی تم لوگ شروع کرو، مجھے تو ان سب چیزوں کا پرہیز ہے، شکر کی مرہضہ جو ہوں، نعمان بیٹا تم بھی کچھ لو۔“ انھوں نے ان دونوں کو تاکید کرتے ہوئے ہر چیز چکھنے پر مجبور کیا پھر وہ نعمان سے مخاطب ہوئیں۔

”تم شاید اس بات سے ناواقف ہوں گے کہ شمع میری بہت ہی عزیز سہیلی صالہ مرحومہ کی نشانی ہے، میں نے جب شمع کو دیکھا تو بے اختیار مجھے صالہ یاد آ گئی، اپنے

سارے تکیہ نقوش اپنی بیٹی میں چھوڑ گئی وہ۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہوا تھا کہ ہماری شادیوں کے بعد ہم کبھی مل نہ سکیں اور آج جب شمع کو دیکھا تو یک بیک صلہ کا خوبصورت چہرہ میری نگاہوں کے آگے رقص کرنے لگا۔ ”نعمان نے سنا تو خوشی اور انبساط کی ایک لہریں اس کے چہرے پر دوڑ گئی وہ اپنی ماں سے کہنے لگا۔

”امی۔۔ چلئے کچھ نہ کچھ شناسائی تو نکل ہی آئی میں پر دگر ام بنا ہی رہا تھا کہ کبھی ان لڑکیوں کو آپ سے ملانے گھر پر مدعو کروں گا لیکن اچانک بخار نے آگھیرا اور یہ خود ہی چلی آئیں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ ان سے مل کر ضرور خوش ہوں گی۔

دراصل رضیہ خاتون کو اللہ تعالیٰ نے بیٹی نہیں دی تھی، انھیں تین اولادیں تھیں اور تینوں ہی بیٹے تھے، سب سے بڑا نعمان ہی تھا، اس سے چھوٹے دو بھائی اور تھے، اس سے چھوٹا عدنان گریجویشن کے پہلے سال میں تھا اور سب سے چھوٹا ریحان تھا جو کہ انٹر میڈیٹ کا طالب علم تھا، اس کے ابو کے بے حد معقول کاروبار تھے، آباؤی جانداد کوٹھی کی شکل میں شہر میں تھی اور شہر سے دور مضافاتی علاقے میں پھلوں کا ایک باغ تھا اور کئی ایکڑ پر زراعت بھی ہوتی تھی، شہر میں بھی کافی پھیلے ہوئے مختلف کاروبار تھے۔۔

رضیہ خاتون جب بھی کسی لڑکی کو دیکھتیں تو کسی زخم سے رستے ہوئے درد کی طرح ان کے احساسات جاگ پڑتے اور بیٹی نہ ہونے کا غم اجاگر ہونے لگتا تو وہ ساری محبتیں اس لڑکی پر نچھاور کر دیتیں لیکن پھر بھی تشنگی باقی رہ جاتی، نعمان اپنی ماں کے احساسات سے بخوبی واقف تھا اسی لیے جب بھی موقع ملتا اپنی ماں کی اس تشنگی کو مٹانے کی کوشش کرتا۔۔

جب صدف اور شمع چائے سے فارغ ہو گئیں تو رضیہ خاتون اور نعمان سے اجازت لے کر لوٹنے لگیں، لوٹتے ہوئے شمع نے ایک اچھٹی نگاہ نعمان پر ڈالی تو اسے بھی اپنی جانب ہی دیکھتا ہوا پایا۔ اس نے دھیرے سے کہا۔

”جب تک مکمل صحت نہ ہو جائے یونیورسٹی مت آئے گا۔“

”جی۔۔ جیسے آپ کا حکم۔۔“ اس نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔۔ ”ویسے

آپ سے التماس بھی ہے کہ اس ناچیز کیلئے دعا ضرور فرمائیے گا۔۔۔ ”نعمان نے کہا تو وہ شرمائی ہوئی آگے بڑھ گئی، اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم رقص کرنے لگا تھا۔

دو ہفتے گزر گئے یہ پندرہ دن شمع نے بے کفنی کے عالم میں گزارے، وہ ہر روز یونیورسٹی جاتی، کلاسس میں شریک رہتی، اپنی دوستوں صدف، شیدا اور شوبھا سے ملتی، وہ لوگ کبھی لائبریری جاتیں، کبھی کینٹین اور کبھی ٹینی کانٹ اور کبھی بیڈ منٹن کھیلتیں لیکن شمع کا دل کبھی بھی نہ لگتا، عجیب طرح کی اضطرابی کیفیت سے ان دنوں وہ دوچار تھی۔ جب وہ خالی الذہن ہوتی تو اچانک ہی نعمان کا سر اپا اس کے تصور میں آدھمکتا اور وہ بے چین ہو جاتی، اپنی اس اضطرابی کیفیت اور بے چینی کو وہ کوئی عنوان نہ دے پارہی تھی۔۔۔

اس کے دل نے بارہا اسے آگاہی دی تھی کہ لگی اسی کا نام محبت ہے، کوئی تیرے دل میں انجانے ہی میں غیر محسوس طریقے سے آسا ہے، کسی کی محبت اور چاہت کا جذبہ تجھ میں دھیرے دھیرے پنپ رہا ہے اور تو اس جذبے سے واقف نہیں ہے، تو شاید اس کسک سے پہلی بار دوچار ہوئی ہے، تیری یہ بے چینی تیرا یہ اضطراب، کسی کا بار بار تیرے تصورات پر چھا جانا، تیری نگاہیں کسی کی منتظر رہنا، ہر دھڑکتے دل پر کسی اپنے کا گمان ہونا، اسی کو تو محبت کہتے ہیں، شمع تو اب پوری طرح نعمان کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔۔۔“

لیکن وہ چونکہ ضدی طبیعت کی مالک تھی اس لیے یہ ملنے سے صاف انکار کر رہی تھی اور اپنی ہٹ پر قائم تھی کہ وہ کسی مرد سے محبت کر ہی نہیں سکتی، تب اس کے اندر ایک آواز گونج بن کر گھنٹیاں سی بجانے لگتی تو پھر تیری اس کیفیت کو کیا کہا جائے، کیا عنوان دیا جائے ”تب وہ بے بس ہو جاتی اور چاروں سمت دیکھنے لگ جاتی اس سے جواب نہ بن پڑتا۔

پندرہ بیس دن غیر حاضری کے بعد آج نعمان یونیورسٹی آیا تھا، جیسے ہی آج کے لکچرس ختم ہوئے وہ ہال سے باہر چلا آیا اور ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ اس کی نگاہیں شمع کی ملٹاشی تھیں اس کا حسین چہرہ، دلنواز پیکر اس کے تصورات کے آئینے میں رقص

کناں تھا لیکن یہاں اسے کہیں دکھائی نہ دے رہا تھا، بالآخر اس کی متلاشی نگاہوں کی تلاش ختم ہوئی اور وہ بہار کے جھونکے کی طرح، اس کی مخالف سمت سے آتی ہوئی دکھائی پڑی، اس کے ساتھ اس کی عزیز سہیلی صدف بھی تھی، وہ وہیں رک کر ان دونوں کا انتظار کرنے لگا، ”اسلام علیکم۔ کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“ وہ دونوں نے ایک آواز ہو کر کہا۔

اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا ”اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ مخلصین کی دعاؤں کے طفیل میں اب مکمل صحت یاب ہو چکا ہوں، کمزوری بھی دور ہو گئی ہے، آپ لوگ کھئے کیا حال چال ہیں، سب خیریت تو ہے نا۔“ نعمان نے کہا۔

”شمع۔“ تم میرا یہیں انتظار کرو میں ذرا لاتبریری سے۔ ایک کتاب لے کر ابھی آتی ہوں، صدف نے کہا اور لاتبریری کی جانب چلی گئی، دراصل وہ چاہتی تھی کہ ان دونوں کو تنہائی میں بات کرنے کا موقع دے، کتاب لینا تو محض اک بہانا تھا، شمع سمجھ گئی تھی اور دل ہی دل میں صدف پر ناراض بھی ہونے لگی تھی، دراصل وہ نعمان سے دور رہنا چاہ رہی تھی۔ ابے ڈر تھا کہ مبادا اس کے جذبے اس پر غالب نہ آجائیں اور وہ اس کے آگے پسپا نہ ہو جائے، وہ گم سم سی اپنی آنکھیں جھکائے برآمدے میں ستون کا سہارا لیے کھڑی تھی اور نعمان اس کا جائزہ لے رہا تھا، وہ آج بلکے نیلے رنگ کی شرٹ شلوار اور اسی رنگ کے کاڈانی ڈوپٹے میں، برہمی بچ رہی تھی، تیل سے بے نیاز سوکھے ریشمی بال اس کی پشت پر لہرا رہے تھے، جب بالوں کی چند لٹیں ہوا کے جھونکھوں پر اس کے کھلتے ہوئے چہرے پر لہرانے لگتیں تو اس کا حسن کچھ اور نکھر جاتا، نعمان اس کے دلنواز حسن کی رعنائیوں میں کھوتا جا رہا تھا، پھر اس نے یک بیک خود کو ہوش کی دنیا میں لے آیا اور اسے مخاطب کرنے لگا۔

”شمع۔! اگر آپ برا نہ مانیں تو کل شام کچھ وقت مجھے دے سکتی ہیں، کچھ اہم گفتگو کرنی ہے آپ سے“ وہ بھی نجانے سوچوں کے کس سمندر میں غرق تھی۔ جب نعمان کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو چونک پڑی اور پوچھا ”کچھ کہا آپ نے مجھ سے؟“ نعمان نے اپنی درخواست دوبارہ پیش کی تو وہ متذبذب کے عالم میں پڑ گئی، پھر کہا۔

”ایسی کون سی بات ہے جو آپ یہاں نہیں کہہ سکتے۔۔۔؟“

”بس یوں سمجھئے کہ بات ہی کچھ ایسی ہے کہ اسے کہنے کے لیے یونیورسٹی کا یہ ماحول سوٹ نہیں کرتا۔“ اگر آپ کو مجھ پر اعتماد ہے تو میری درخواست پر غور کیجئے گا۔۔۔

”نعمان دبے دبے لمبے میں کہا تو وہ کچھ دیر سوچتی رہی اور کہا۔ ”ٹھیک ہے کل شام چار بجے کے بعد ہم ملیں گے، آپ مجھے بتادیں کہ کہاں ملاقات ہوگی۔۔۔“ پھر نعمان نے اسے ملاقات کا مقام بتا دیا، اتنے میں صدف لائبریری سے اپنی مطلوبہ کتاب لے کر آگئی تھی، پھر انھوں نے ایک دوسرے پر الوداعی نظریں ڈالیں اور اپنی اپنی راہ لی۔۔۔

آج کی شام بہت دلفریب ہو گئی تھی، دن بھر کی تپتی ہوئی دھوپ کے بعد شام میں نیلے آسمان پر جا بجا سرمئی بادلوں نے اپنے شامیانے تان لیے تھے، ہواؤں میں رچی ختنکی آس پاس میں ہوئی بارش کا پتہ دے رہی تھی، شمع حسب وعدہ ٹھیک چار بجے اندر پارک کے میں گئیٹ پر پہنچ گئی تھی، جہاں نعمان اپنی آنکھیں بچھائے اس کا منتظر تھا، پھر وہ دونوں اندر پارک کے ایک ایسے گوشے میں جا بیٹھے جہاں آس پاس میں کوئی نہ تھا۔ شمع جہاں بیٹھی تھی اس کے قریب ہی خوش رنگ پھولوں سے لدا تختہ تھا، جس سے بھینی بھینی خوشبو مہک رہی تھی۔ نعمان اس سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے تنے کا سہارا لیے بیٹھ گیا۔ دونوں ہی خاموش تھے، یوں لگ رہا تھا جیسے نعمان اپنی بات شروع کرنے کیلئے مناسب الفاظ کا انتخاب کر رہا ہو۔ شمع کبھی غلاؤں میں دیکھتی اور کبھی اپنی اچلتی ہوئی نگاہ نعمان کے چہرے پر مرکوز کر دیتی تو نعمان کو سوچوں میں ڈوبا ہوا پاتی۔

لمحے آہستہ آہستہ سرکتے جا رہے تھے، نعمان نے اپنی بات شروع نہ کی تھی، کافی انتظار کے بعد بھی جب نعمان خاموش ہی رہا تو شمع نے خود اسے مخاطب کیا:

”کہئے نعمان صاحب۔۔۔ آپ نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے، کیا کہنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے۔۔۔“

اس کے سوال پر نعمان چونکا اور کچھ دیر توقف کے بعد کہنے لگا، یہی کہ آپ مجھے بہت بھاگتی ہیں، میں نے آپ کو زندگی کے اس طویل سفر کیلئے اپنے ہم سفر کے طور پر

چن لیا ہے، آپ کا ساتھ اگر نصیب ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی حسین رفاقت میں زندگی کا یہ طویل اور کٹھن سفر آرام سے گزر جائے گا، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی مرضی معلوم کر کے ہی آپ کو پرپوز کر دوں۔۔۔“

لیکن نعمان صاحب۔ شاید آپ کو یہ جان کر افسوس ہو کہ میں ابھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی، شمع نے سپاٹ لہجے میں کہا۔۔۔

لیکن کیوں۔۔؟ آپ یہ کیوں کر کہہ رہی ہیں کہ آپ شادی نہیں کرنا چاہتیں، کیا آپ یہ بھول رہی ہیں کہ آپ لڑکی ہیں، صنف نازک سے تعلق ہے آپ کا اور یہ کہ ہمارا معاشرہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ساری عمر کوئی لڑکی کنواری رہ جائے آپ کیونکر سماجی اور معاشرتی نظام سے انحراف کر سکتی ہیں کیونکر انکار کر سکتی ہیں۔؟“

”اس لیے کہ میں نے مرد کا ایک ایسا روپ دیکھا ہے جس نے مجھے مرد ذات سے نفرت کا سبق دیا ہے ایک ایسے ظالم شخص کی تصویر میرے ذہن پر چسپاں ہے جسے یاد جو دکوشش کے میں کھرچ نہیں پاتی۔ وہ ظالم شخص کوئی اور نہیں میرا باپ تھا، جس کا خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے جس نے میری ماں کو تڑپا تڑپا کر، ترسا ترسا کر مارا ہے وہ جب بھی گھر میں داخل ہوتا تو میں گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوتی وہ شراب کے نشے میں دھت گھر میں داخل ہوتا تو میری امی بے بسی سے چاروں سمت دیکھنے لگتیں، پھر وہ میری ماں کو مارنے بیٹھنے لگتا اور وہ رقم حاصل کر لیتا جو کہ اس نے مشین چلا چلا کر کپڑے سی سی کر ہم تینوں بھائی بہنوں کی ضروریات کیلئے پس انداز کر رکھے تھے، اور پھر وہ رقم جو کہ میری امی نے اپنے لو کے ایک ایک قطرہ کا پسینہ بہا کر کمائی ہوئی تھی شراب کی تندر کر دیتا، میری امی کب تک یہ ظلم سہتیں وہ بھی تو ایک صنف نازک تھیں، بالآخر انھوں نے ہم بہن بھائیوں کو بے یارو مددگار چھوڑ کر ہمیشہ کیلئے اپنی آنکھیں موند لیں۔ ایک رات ایسا سونیں کہ پھر اٹھ نہ سکیں، اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ ہمارے باپ کو جب ان کی موت کی خبر ملی تو اس نے ایک بار بھی آکر ہم بایرون کا حال جلنے کی کوشش نہ کی۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ انھوں نے دوسری شادی رچالی ہے اور اپنی بیوی کے ہمراہ بنگلور

چلے گئے ہیں۔۔۔ "اتنا کھتے کھتے اس کی آواز بھر آگئی، اس کا سارا دکھ سارا غم آنکھوں کی راہ سے بہنے لگا، آنکھیں تھی کہ سادوں برسا رہی تھیں۔

شمع کی اس حالت پر نعمان پریشان ہوا اٹھا۔ وہ اس کے بہت قریب پہنچ کر اس کو بچھانے لگا۔ اس کے آنسو اپنے رومال میں جذب کر کے اسے دلاسہ دینے لگا۔

مجھے یقین تھا شمع کہ ضرور تمہارے ذہن پر کوئی ایسا صدمہ ہے جس کے باعث تم اپنی جنس مخالف سے متفر ہو چکی ہو، تبھی تمہارے مزاج میں مردوں سے نفرت کا جذبہ بھرا ہوا ہے۔ لیکن شمع تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہر مرد ایک سا ہوتا ہے۔ دراصل بچپن میں تم نے جو کچھ دیکھا تمہارے معصوم ذہن و احساسات نے اسے جوں کا توں قبول کر لیا اور ایک ظالم اور بدکردار مرد کی تصویر تمہارے معصوم ذہن سے چمٹ کر رہ گئی، جسے باوجود کوشش کے تم خود سے الگ نہیں کر پائیں، تمہارے اندر مرد ذات سے نفرت کا جذبہ پنتپتا رہا اور ایک خوف سا تمہارے ذہن پر چھا گیا جس کے باعث تم یہ طے کرنے سے قاصر ہو کہ کون شخص شریف و باکردار ہے اور کون نہیں، لیکن اس میں تمہارا کوئی دوش نہیں ہے تمہارا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ تم نے جو کچھ دیکھا اسی کو سچ مان لیا۔ تمہارے معصوم ذہن پر اسی کے اثرات چھاتے گئے، لیکن شمع میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اپنی محبت اپنی چاہت، اپنے پیار اپنے خلوص اور اپنے سلوک سے تمہارے ذہن سے وہ سارے نقوش مٹا ڈالوں گا تاکہ تم ہم مردوں پر بھروسہ کرنے لگ جاؤ، تم انہیں ظالم و جابر نہ سمجھو بلکہ اپنا مسیحا جانو، اعتماد کے قابل جانو۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارے ذہن پر چھائے خوف و دہشت کے وہ سائے دور ہو جائے، "نجانے نعمان کے لہجے کی تاثیر تھی یا پھر اس کی محبت کی تپش کہ وہ موم کہ گڑیا کی طرح دھیرے دھیرے پگھلتی چلی گئی اور نعمان کے عزم کے آگے جھگ گئی۔

طائر وقت سانس لینے کیلئے بھی نہ رکتا ہے، اس نے اپنے پر پھیلانے اور برسوں کا سفر طے کر ڈالا، شمع نے ایم، اے کی تکمیل کر لی اور گھر بیٹھی رہی، نعمان نے ایم اے کی تکمیل کے بعد ایم بی اے میں داخلہ لے لیا، معاش کی فکر سے آزاد وہ تعلیمی زینے طے

کرنے لگا۔ اس درمیان وہ شمع کے استے قریب آ گیا کہ وہ ہرپل، ہر لمحہ اسی کی یاد میں کھوئی رہنے لگی۔ اس کے ذہن پر چھائے خوف و ہراس کے سایے اب مکمل طور پر دور ہو گئے تھے۔ اور شمع کے تصور است پر اب صرف اسی کا قبضہ تھا۔

کچھتے ہیں انسانی خواہشات کی تکمیل صرف خالق کائنات کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ جو مناسب خیال کرتا ہے وہی انسانی زندگی میں ہوتا ہے۔ غمخ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جب اس کے دل میں مرد و ذات سے نفرت کا جذبہ پھپھکا رہا تھا تب اللہ تعالیٰ نے نعمان کے ذریعہ اس جذبہ کو مٹا ڈالا اور جب کہ اس کا رونا رواں نعمان کی محبت میں ڈوبا تھا تو حالات بتا رہے تھے کہ وہ اس سے جدا ہو جائے گی۔

اس کی زندگی میں بہاریں آئے تھے۔ اچانک عزاؤں کے بل بوتے پر دیا تھا اس کی محبت کی ناؤ منجھار میں ڈونے لگی تھی۔ اس کی بھائی نے اسے بتایا کہ اس کے بھیا نے اس کا رشتہ اپنے ایک قریبی دوست کے کزن سے لپکا کر دیا ہے۔ اور شادی اگلے ماہ طے پائی ہے۔ یہ سن کر اس کے سارے اوسان خطا ہو گئے۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے بھیا کی مرضی کے آگے اپنی مرضی چلائی اس کے بھائی نے اپنی بیٹی کی طرح اس کی پرورش کی تھی۔ اس کی ضد کے آگے اسے ایم اے میں داخلہ دلایا تھا اور نہ وہ دو دو سال قبل ہی یہ چاہتے تھے کہ کسی اچھے گھرانے میں اس کی شادی کر دیں۔ لیکن رعنا بھائی کی وساطت سے اس نے اپنی مرضی اپنے بھائی تک بھیجی تھی اور ایم اے پڑھنے کی اجازت طلب کی تھی تب اس کے بھیا نے اس شرط پر اسے اجازت دی تھی کہ ایم اے کے بعد وہ اس کی شادی اپنی مرضی سے طے کر دیں گے اسے کسی عذر یا اعتراض کی اجازت نہ دی جائے گی۔ تب اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ ایم اے کے بعد وہ جہاں چاہے اس کا رشتہ طے کر سکتے ہیں۔

اس طرح اسی دو سال کی چھوٹ مل گئی تھی۔ لیکن اب وہ کیا کرے وہ سوچ میں ڈوب جاتی اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ پٹلوں کے کنارے بار بار بھیس گئے لگتے۔ لیکن بھیا سے

بغاوت کرنے کی ہمت وہ خود میں نہ پاتی، وہ اندر ہی اندر ٹوٹنے لگی تھی۔

رعنا بھابی شادی کی تیاریوں میں جٹ گئی تھیں انھیں اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ وہ اس کا حال چال پوچھ لیتیں، ان کا تو ایک ایک لمحہ کسی قیمتی شے کی طرح ہو گیا تھا۔ وقت کم تھا اور کام بے شمار کہیں کمپڑوں کی شاپنگ ہو رہی ہے تو کہیں فرنیچر کا آرڈر دیا جا رہا ہے، صبح بازار کے لیے نکل پڑتیں تو شام میں ہی تھک تھکا کر گھر لوٹتیں، جو کچھ بنائی یا کڑھائی کا کام ہوتا تو رعنا بھابی اسے سونپتی ہوئی کھتیں۔

”شمع۔۔۔ یہ میز پوش پر پھول بوٹے بنادو میں ذرا بازار ہو آتی ہوں، درزی کو کپڑے دے آؤں تو ایک اور ذمہ داری پوری ہو جائے گی۔۔۔“

وہ اپنے اڈ آئے ہوئے آنسوؤں کو پیتی ہوئی کھتی: جی اچھا بھابی جان۔۔۔ وہ جب اس کی بھیگی بھیگی آواز پر کچھ نوٹس بھی لیتیں تو اسے سمجھانے لگ جاتیں۔

”اس طرح افسردہ نہیں رہتے شمع، ہر لڑکی کو والدین کا گھر کبھی نہ کبھی چھوڑنا ہی پڑتا ہے، اس کا اصل گھر تو سسرال ہی ہوتا ہے، اور پھر تمہارے بھیا نے تمہارے لیے بہت خوب رو، بینڈسم دولہا پسند کیا ہے، تم دیکھو گی تو اپنی قسمت پر خود ہی رشک کرنے لگو گی۔۔۔“ رعنا بھابی اس کے دکھ کو اپنے بھائی کے گھر چھوٹنے پر افسردگی پر محمول کرتیں۔۔۔

پھر شمع نے اپنی کشتی محبت کو اس ناخدا کے ہاتھ چھوڑ دیا جو کہ اس کائنات کا خالق تھا، یہ اس کی بد نصیبی ہی تھی کہ نعمان ٹریننگ کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا اور مزید ایک مہینے تک اس کے واپس ہونے کے امکانات نہ تھے اور نہ ہی اس سے ملاقات کی کوئی سبیل۔۔۔

تقدیر کے آگے ہر کوئی بے بس ہوتا ہے شمع بھی بے بسی کی تصویر بنی ہوئی تھی، یہاں تک کہ وہ وقت بھی آ گیا جب کہ اسے دلہن بنا کر عروسی لباس میں وداع کر دیا گیا، وداعی کے وقت وہ اتنا روئی کہ اس کی بھابی کا دامن اس کے آنسوؤں سے بھیگ بھیگ گیا، اس کے بھیا زاہد صاحب نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر اسے وداع کر دیا، وہ اپنے اجنبی

جیون ساتھی کا انجانا انجانا سا خاک اپنے ذہن میں بسائے بھائی کے گھر کی دلیز چھوڑے
سسرال چلی گئی۔

جملہ عروسی میں جب اس کے جسم و جان کا مالک اس کے قریب آیا اور اس کا
سرخ ریشمی گھونگھٹ الٹ کر کھنے لگا:

”حضور۔۔۔ ذرا اپنی آنکھوں سے پلکوں کی یہ مٹلی چلمن تو اٹھائیے۔۔۔ تو چونک کر
اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں، اس کے ردِ رو خوبصورت شیردانی میں ملبوس نعمان اپنی
تمام تر وجاہتوں کے ساتھ بیٹھا اسے میٹھی میٹھی نظروں سے تک رہا تھا۔۔۔“

وہ خوشی کے بے انتہا احساس کے زیر اثر رودی اور کہا۔۔۔ ”یہ سارا ڈرامہ کیا
تھا نعمان۔۔۔ میری تو جان ہی نکلی جا رہی تھی۔۔۔؟“

”شیخ۔۔۔ میری ہی گزارش پر زاہد بھائی نے یہ سب کچھ راز میں رکھا،
کیونکہ یار جب کوئی کسی چیز کو کھوکھو دوبارہ پالیتا ہے تو وہ خوشی کچھ اور ہی ہوتی ہے اور
شاید تم یہ بھول گئی تھیں کہ میں نے پہلی ملاقات میں تم سے کہا تھا کہ اگر ان آنکھوں نے
تمہارے علاوہ کسی اور کو دیکھنے کے جرم کا ارتکاب کیا تو خدا کرے کہ ان آنکھوں کی
بصارت ہی چھن جائے۔۔۔“ نعمان اس کے ملکوٹی حسن کی پھیلی ہوئی خوشبو سے مدہوش
ہوتے ہوئے کہنے لگا تو اس نے اپنے لرزتے ہوئے حنائی ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے
اور کہا:

”مجھے آپ کی ان آنکھوں پر اور ان کی پسند پر ناز ہے۔۔۔“

”آپ کی پر خلوص چاہتیں اور پاک جذبوں نے بالآخر مجھے جیت ہی لیا“ پھر وہ
نعمان کی محبت بھری آغوش میں ساقی چلی گئی۔۔۔“

بھورانی

”میں تو کبھی بھول ڈیشان بھائی کو کوئی ایسی ہی لڑکی سوت کرے گی جس نے بہت کچھ
 اور نیچا ہوا رنگ صاف ہم نکھیں بڑی بڑی کٹورا ہی اور کھڑی تاک والی اعلیٰ تعلیم یافتہ کسی
 بڑے امیر کبیر گھرانے سے تعلق ہو۔“ صدف جو ڈیشان کی پیچازادہ بہن تھی بڑی اداانہ
 کہہ رہی تھی وہاں پہلے یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ کر گئی۔
 ”اب یہاں صدف تہہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہو ڈیشان بھائی خود بھی تو کسی شخص سے ایسے لکھ
 نہیں ہیں۔“ ڈیشان نے کھالی تھلہ کھلا ہوا رنگ اور سیاہ گھنگریلے بالی، اعلیٰ تعلیم یافتہ یورپ
 اعلیٰ درجہ پڑھنا میں تو کبھی ہوں نہ لیکو بھی ان کی شریک زندگی بننے کی وہ مصر و واپسی تقریر پورے
 رشک کر کے کی تھی۔ لیکن ڈیشان نے اچھی دیکھنے کا طریقہ لیا۔ ان کے دل میں چاہت نہ تھی
 یہ کہ وہ بھولے ہیں ڈیشان بھائی کا آپنا انتخاب کیسا ہوتا ہے۔ کس غول پر غی کو پسند کرتے ہیں۔
 ہیں ظاہر ہے وہ جیسے ہیں ان کی اپنی پسند بھی تو اتنی ہی اعلیٰ ہوگی۔“ نادیرہ جس نے ڈیشان
 کو من ہی من اپنے دل کے جنگھاسن پر سٹھکانے لگا رکھا تھا کہنے لگی سپوہ خود بھی بہت
 خوبصورت تھی مگر اسے اُمید تھی کہ ڈیشان اسے چھوڑ دے گا۔ پادیرہ ایسے کے ماموں
 کی لڑکی تھی اسے یہ بھی علم تھا کہ اس کی پھر بھی چاہت نہ ہوگی اسے لکھڑو میٹر ایسے لگا لے گا
 دیکھا کرتی ہیں۔

”اے نادیرہ کچا پچے حال نہ کہ نورین کو بے حد خوشی ہوئی ڈیشان اس کا اکلوتا بھائی تھا
 اور اپنے بھائی کی تعریف سن کر ظاہر ہے کہ ہر بہن فر سے پھولنے لگتی ہے اس نے بھی

اپنے بھائی کی تعریف میں زمین و آسمان کے کلابے ملائے ہیں کوئی شک نہ اٹھا رہا تھی۔
اے لڑکیو! کیا بھوہا ہے۔۔۔ اسی نے صدمہ بیگم کی کرخت آواز ان لوگوں کی
سماعت سے نکلنا شروع کیا۔ چاروں گھبرا کر اپنے اپنے گھروں سے باہر نکلے۔ بیگم صدف
کی والدہ تھیں اور دیشان و نورین کی چچی جان لیکن سبھی بڑی بڑی عورتیں تھیں۔ بیگم صدف
کا۔ ان کے آگے خاندان کا کوئی لڑکا یا لڑکی اور چچی آواز میں بات تک نہیں کر سکتی تھیں۔
یہاں تک کہ صدف کے ابو غازیہ حسن بھی ان کے آگے ہتھیار ڈال دینے سے نہیں عافیت
بچتے تھے۔

زائد نصین اور عابد حسن دو بھائی تھے ایک سی کوٹھی کے دو مختلف حصوں میں
 الگ الگ رہتے تھے لیکن دونوں بھائیوں کا بزنس مشترک تھا، شہر کے مصروف ترین بازار
 عابد سرکل میں ان کی کپڑے کی بہت بڑی دکان تھی جس کی مالیت لاکھوں کی تھی۔ ان
 دونوں نے اپنی زندگی کا ایک اصول اور ضابطہ بنا رکھا تھا کہ بزنس کی ساری باتیں گھر کے
 باہر طے کی جائیں گی۔ گھر میں اور گھر والیوں میں کوئی تذکرہ نہ ہو گا چنانچہ اسی اصول اور
 ضابطہ پر چل کر دونوں کے گھر خوشحالی کے مظہر تھے اور کاروبار جو کہ چند ہزار سے شروع
 کیا تھا اب لاکھوں تک جا پہنچا تھا۔

کو بھی تو ایک ہی تھی لیکن دو پورٹن علیحدہ علیحدہ تھے صدر دروازہ جو کہ میں شہیت
کھلاتا تھا ایک ہی تھا۔ دونوں گھروں کو ایک چھوٹی سی دیوار علیحدہ کئے ہوئے تھی لیکن
ایسی کوئی دیوار ان کے دلوں میں ابھی تک نہ بن پائی تھی۔ یوں تو گھر الگ تھے لیکن الرحمہ
سب ایک ہی جگہ ایک ہی دسترخوان پر مل جل کر کھانا پکارتے تھے۔

زاہد حسین کی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ بڑی لڑکی شیریں کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ ریاض میں مقیم تھی۔ لڑکا ویشان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ عہدہ پر فائز تھا اور چھوٹی بیٹی تھی نورین جو ابھی نویر تعلیم تھی۔ وہ بہت کم سال کی تھی۔ گریجویٹیشن کر رہی تھی۔ زاہد حسین کو اللہ نے دو اولادیں عطا کی تھیں۔ عاصمہ بڑا تھا اور صدف چھوٹی۔ عاصمہ بزنس میں جمشٹ کا کورس مکمل کر کے اپنے تایا اور ابو کے ساتھ ریاض میں جٹ

بڑا بزلہ سبج تھا، اکثر لڑکیوں کی محفل میں جا بیٹھتا اور اپنے ننٹے لطیفوں سے ہنسا ہنسا کر ہر ایک کا برا حال کر ڈالتا، ویسے وہ ساری لڑکیوں کا بہت ہی پیارا بھائی تھا، ہر ایک اپنی ضرورت کی چیزیں اسی سے منگواتیں اور وہ ہر ایک کی فرمائش بڑی خندہ پیشانی سے پوری کرتا، موسم گرما کی شام تھی، آج کی شام اچانک ہی خوشگوار ہو گئی تھی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں، یوں لگ رہا تھا کہ اطراف میں ضرور کھیں بارش ہوئی تھی کیونکہ ہوائیں اپنے ہمراہ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی لئے ہوئے تھیں، دن بھر کی تپتی دھوپ کے بعد اگر اچانک ہی موسم اس طرح فرحت بخش ہو جائے تو کون نہیں چاہے گا کہ کھلے صحن میں جا بیٹھیں چنانچہ چاروں لڑکیاں آم کے درخت تلے تخت ڈلوائے اپنا قبضہ جمائے بیٹھی تھیں، ٹھنڈی ہوائیں بہت بھلی لگ رہی تھیں، صدف، ملیحہ، نادیا اور نورین بہت چمک رہی تھیں، ادھر ادھر کی باتوں کے بعد پھر وہی ذکر چل نکلا تھا کہ ذیشان کی دلن کیسی ہونی چاہیئے انھوں نے ذکر چھیڑا ہی تھا کہ ذیشان صدر دروازے سے سیدھا ان ہی کی طرف آ پہنچا۔

”لگتا ہے تم چاروں کو کوئی اور کام ہے ہی نہیں، جب دیکھو قبضہ جمائے ادھر ادھر کی منطق لئے بیٹھی ہیں، اور آپ کو ہمارے اس طرح بیٹھے رہنے سے سدا کا ہر کیوں ہے ذیشان بھائی۔“ صدف نے بھی جوابی کارروائی کر ڈالی۔

”بھئی مجھے ہر کیوں ہو گا۔! دراصل میں یہ چاہتا ہوں کہ تم سب ہی پڑھائی لکھائی میں مصروف رہا کرو، آگے بڑھو، یہ نہیں کہ بے کار وقت برباد کرتی رہا کرو، اس طرح سے کہ جب دیکھو ہنسی میں مصروف ہو،“ ذیشان سنجیدگی سے انھیں سمجھانے لگا۔

”دراصل ذیشان بھائی، آج اچانک ہی موسم اتنا خوشگوار ہو گیا ہے کہ ہم سب نے سوچا چلو آم کے پیر تلے جا بیٹھیں اور موسم سے لطف اندوز ہوں، بھلا ہر روز تو اس طرح کا موسم رہے گا نہیں! نورین نے بھائی سے کہا۔

”ہاں واقعی موسم تو بہت دلنواز ہو گیا ہے، آج دن بھر شدید دھوپ رہی اور اب جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں تو حقیقت میں فرحت بخش محسوس ہو رہی ہیں۔

کیوں نہ اس فرحت میں مزید اضافہ کیا جائے، اگر گرما گرم چائے پی جائے تو کیسا رہے گا؟
 ذیشان نے چاروں کی طرف دیکھا، ”تجویز بروقت ہے، چائے ضرور پینی چاہیئے۔ نادیا نے
 تائید کی۔

”تم چاروں میں سب سے اچھی چائے کون بنا سکتا ہے وہ اٹھ جائے اور شاندار
 قسم کی چائے بنا لائے، اگر چائے واقعی شاندار ہوگی تو انعام بھی ملے گا۔“ ذیشان نے انعام
 کا آفر کیا تو چاروں لڑکیاں ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگیں، پھر نادیا اٹھتے ہوئے
 باورچی خانے کی طرف چلی گئی، تھوڑی ہی دیر بعد وہ چائے کے ساتھ گرما گرم پکوڑے بھی بنا
 لائی تھی، وہ سب پکوڑے کھانے لگے، پھر نورین نے چائے پیالیوں میں ڈالی اور پہلا کپ
 ذیشان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”بھائی جان چائے حاضر ہے، اپنا وعدہ نہ بھولے گا۔“
 ”ذیشان چائے پینے لگا، واقعی بہت لذیذ چائے بنی تھی، جیسے ہی سب نے چائے ختم کی، ہر
 ایک کی نگاہ ذیشان پر نکلی تھی کہ اس کا فیصلہ کیا ہوگا، ذیشان بہت دیر تک سوچتا رہا پھر اس
 نے صدف سے پوچھا، ”کیوں صدف چائے کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“

”واقعی نادیا نے تو کمال ہی کر دیا، ذیشان بھائی میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اتنی
 شاندار چائے بھی بنا سکتی ہے، لگتا ہے میڈم آپ کو مرعوب کرنا چاہتی ہیں، ویسے
 ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ وہ انعام کی مستحق ہے،“ صدف نے اپنی رائے ظاہر کی۔
 ”اور ملیجہ تم کیا کہتی ہو اس بارے میں“ ذیشان نے ملیجہ کو گھسیٹا۔

”میں صدف کی رائے سے متفق ہوں، نادیا کو ضرور انعام ملنا چاہیئے۔ آپ نے
 تو صرف چائے کی فرمائش کی تھی لیکن بے چاری نے کافی محنت بھی کی اور پکوڑے بھی
 بنا لائی، گرما گرم پکوڑے بڑے مزے دار بھی تھے۔“ ملیجہ نے بھی نادیا کے حق میں
 ووٹ دیا۔

”یوں لگتا ہے تم سب نے میری پاکٹ پر ڈاکہ ڈالنے کی کوئی اسکیم پہلے ہی سے
 تیار کر رکھی تھی۔ چلو ٹھیک ہے چائے واقعی لذیذ تھی اور نادیا کو ضرور انعام سے نواز
 جائے گا،“ ذیشان نے اپنا فیصلہ سنایا۔

”تھینک یوسر۔“ نادیدہ خوشی کے جذبات سے لبریز کہ اٹھی۔

”یہ میں سر کہاں سے ہو گیا تمہارا۔؟“ ڈیشان نے مسکراتے ہوئے کہا تو نادیدہ جھینپ سی گئی، پھر ڈیشان نے اپنی جیب سے پرس نکال کر سو روپیے کا نوٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا، ”دیکھو نادیدہ اس انعام میں تم چاروں کا حق ہے، مزدا تھیٹر میں ایک بہت ہی عمدہ اور گھریلو قسم کی فلم ”کوڑا کاغذ“ لگی ہے۔ تم چاروں دیکھ آؤ اور ساتھ ہی اس کریم بھی کھا لینا۔ میں سمجھتا ہوں فلم سبق آموز ہے اور ہر لڑکی کو دیکھ کر سبق سیکھنا چاہیے۔ چچی جان سے کہہ کر میں تم لوگوں کو اجازت دلاؤں گا۔“ ڈیشان نے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔

”بہت بہت شکریہ۔ ڈیشان بھائی زندہ باد، ڈیشان بھائی زندہ باد۔“ چاروں نے مل کر خوشی میں ترنہ بلند کیا اور فلم دیکھنے جانے کی تیاری میں جٹ گئیں۔

”حسین منزل میں ہمیشہ ہی چل پہل رہا کرتی تھی۔ زاہد حسین اور عابد حسین کی اکلوتی بہن صابرہ بیگم بھی حسین منزل سے کچھ ہی فاصلے پر رہا کرتی تھیں۔ اپنے گھر میں مگن، ان کی اپنی ازدواجی زندگی بھی اللہ کے فضل و کرم سے بے حد خوش حال تھی۔ انھیں اللہ نے ایک ہی اولاد ملیحہ کے روپ میں دی تھی، لیکن دونوں میاں بیوی نے ہر حال میں راضی بہ رجا رہنے والی طبیعت پائی تھی، انھوں نے ملیحہ کو ہر طرح کی تربیت دی تھی، امور خانہ داری سے لے کر بنانی سلائی تک ہر کام میں وہ ماہر تھی جب کبھی خالی ہوتی اپنے ماموں کے گھر چلی آتی اور نورین، صدف اور نادیدہ سے مل کر محفلس جاتی۔ آج بھی وہ اپنی امی سے اجازت لے کر حسین منزل چلی آئی۔“

”کمو نورین کیا ہو رہا ہے۔“

”نورین کسی کام میں مشغول تھی جیسے ہی ملیحہ کی آواز اس کی سماعت آئے ٹکرائی وہ اس کی جانب متوجہ ہو گئی، او ملیحہ چلو صدف کو بلا لیتے ہیں وہ دونوں صدف کو آواز دے رہی ہیں۔“

دینے آگے بڑھنے لگیں کہ عامر چلا آیا۔

”ارے ارے یہ بلائیں کدھر کا بچ کر رہی ہیں آج۔“

”دیکھو عامر میں سمجھائے دیتی ہوں، تم دن بدن جنت بڑھتے جا رہے ہو، کیا اپنے سے بڑوں سے اسی طرح گفتگو کی جاتی ہے۔ لیجئے اے ڈانٹ دیا۔“ کیا مٹھا بلجھا باجی اپنے سے بڑے، بڑی مشکل ہے وہ مہینے کی بڑی ہیں آپ مجھے پھلے فرق بھی کوئی فرق ہے، پرسوں ہی امی بتا رہی تھیں کہ آپ مجھ سے صرف دو مہینے پہلے اسی جہان فانی میں تشریف لائی تھیں۔ عامر بھلا کب تکچھے رہتے وہاں تھیں۔

”بچا ہے دو مہینے ہوں یا دو دن، تمہیں تو ایسی فرقی کو اتنا سہی پڑے گا اور ہم بندوں کا ادب کرنا ہی پڑے گا۔“ تمہاری شکایتیں نشان چلاتی ہے جنہو کہ دوں گی۔ لیجئے، نے جسے ہی نشان دکھانے کا نام لیا عامر نے وہاں سے کھسک جاتے ہیں اپنی ہافیت جانی، اور ہنستا ہوا وہاں سے چلتا بنا۔

اچانک ہی حسین منزل پر اداسوں نے اپنا ڈیرہ جما دیا تھا جہر سو خاموشی مسلط تھی اور میر چہرے پر پریشانی اور فکر کی پوچھائیاں صاف پڑھی جاسکتی تھیں۔ سب سے زیادہ پریشان تو نشان تھا۔ اس کے تو ہوش ہی گم تھے کیوں نہ ہوں۔ اس کی عزیز ماما جلتی رہتی اس کی ماں جنھوں نے اس کی معمول سے معمول تکلیف پر اپنی راتوں کی نیندیں اور دن کا چین قربان کیا تھا، اس کی امی عائشہ بیگم پر شدید قسم کا دل کا دودھ پڑا تھا، انھیں فدا ہی، میڈون ہاسپتال میں داخل کروا دیا گیا تھا اور گذشتہ تین دنوں سے انھیں ”شریزا ایمر جنسی وارڈ“ میں رکھا گیا تھا، سرمانے رکھا مانیئر ان کی نبض کی رفتار بتا رہا تھا ہارک جانتے ہو کھنک دیا جاتا تھا جو کہ قطرہ قطرہ ان کے جسم میں داخل ہو رہا تھا، موت اور نہایت میں جنگ جاری تھی فتح کسی کی ہوگی کوئی کہہ نہیں سکتا تھا، نوری کی غالب بھی قائل پدم تھی کہ شیشہ تین راتوں سے وہ بغیر پلک چھپکائے ماں کے سرمانے بیٹھی رہی تھیں، دو راتے شام میں ملنے کے اوقات میں گھر کے سارے افراد اسپتال چلے آتے اور عائشہ بیگم کی صحبت کیلئے عاتیں مانگا کرتے، تقریباً ایک ہفتہ کی مسلسل دوا دھوپ اور ڈاکٹروں کی توجہ اور مہنت

منٹ کے چیک اپ کے باعث اللہ نے کرم فرمایا اور عائشہ بیگم کی صحت کچھ سنبھل پائی۔ انھیں اب دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس کمرے سے لگے ہوئے دو کمرے اور تھے اور ان کمروں کے مقابل میں اسی طرز کے تین کمرے اور تھے ان کمروں کو کشادہ راہداری علیحدہ کرتی تھی۔

آج صبح ڈیٹان ٹفن کیرئیر لئے تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے جیسے ہی اپنی امی کے کمرے کی جانب بڑھے ایک لڑکی سے ٹکرا گئے۔ پھر معذرت خواہ لہجے میں مخاطب ہوئے ”معاف کیجئے گا میں ذرا جلدی میں تھا“ ڈیٹان نے متانت سے کہا۔

”جی کوئی بات نہیں۔ آئندہ احتیاط ضرور کیجئے گا۔ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے آہستہ سے کہا اور اپنے سر پر اوڑھنی کا پلو جاتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ ڈیٹان وہیں ٹھہرے بہت دور تک اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ اس کی پشت پر کالے کالے دراز بالوں کی چوٹی لہرا رہی تھی۔ اس کا سانولا سلونا چہرہ جس پر ہلاکی کشش تھی انھیں متحیر کئے ہوئے تھا۔ عام سا معمولی قسم کا صاف ستھرا لباس اس نے زیب تن کیا ہوا تھا۔ بڑی بڑی جھیل جیسی آنکھیں بے حد خوبصورت تھیں۔ خود بخود ان میں ڈوب جانے کو ڈیٹان کا جی چاہنے لگا۔ شرم و حیا کی دیوار چادر اس کے سلونے چہرے پر تنی ہوئی تھی پھر سر پر دوپٹہ واقعی غضب ڈھا رہا تھا۔ پھر اس کا وہ پروقار لہجہ۔ ڈیٹان اپنے ہوش کھوئے دم بخود دور تک اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ نورین نجانے کب ان کے قریب آٹھری تھی اور اپنے بھائی کو اس طرح مبسوت کھڑا دیکھتی رہی تو آواز دے ڈالی ”بھائی جان کیا دیکھ رہے ہیں آپ اس جانب؟“

وہ چونک پڑے اور چوری پکڑے جانے پر شرمندہ شرمندہ سے بہن کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھ بیٹھے ”نورین تم نے دیکھا ابھی کچھ دیر پہلے ایک لڑکی مجھ سے ٹکرا گئی تھی اور اس جانب گئی ہے؟“

”میں نے یہ تو نہیں دیکھا کہ وہ آپ سے ٹکرائی تھی لیکن یہ ضرور جانتی ہوں کہ وہ عندلیب ہے۔ امی کے بازو والے کمرے میں اس کی خالہ امی داخل ہیں۔ انھیں بھی

دل کا دورہ پڑا تھا لیکن اب اللہ کا فضل ہے کہ وہ ٹھیک ہیں ابھی کچھ دیر قبل ہی وہ مجھ سے مل کر گئی ہے بہت پیاری لڑکی ہے میں نے اس سے دوستی بھی کر لی ہے جب کوئی نہیں ہوتا اور اسکی خالہ امی سوئی ہوتی ہیں تو وہ ہمارے پاس چلی آتی ہے، بہت ساری پیاری پیاری باتیں کرتی ہے، امی کو تو وہ نجانے کیوں پسند آگئی ہے مجھے آرام کرنے کیلئے کہہ کر خود امی کے بہت سے کام کرنے لگتی ہے، سنا ہے بے چاری کی امی بچپن میں چل بسی تھیں اور خالہ امی بی نے پرورش کی ہے، اس کے والد میں ضرور لیکن دوسری بیوی کے ساتھ رہتے ہیں اور عندلیب کو اس کی خالہ کے ہاں چھوڑ رکھا ہے۔

نورین نے تفصیلی طور پر عندلیب کا تعارف پیش کیا تو ذیشان نے نفن کیریر نورین کو تمہا دیا۔ ماں کی حالت دیکھی اور پھر آفس کیلئے روانہ ہو گئے۔

ذیشان شام میں آفس سے سیدھے اسپتال پہنچے ماں سے ملے، اب ان کی صحت بہتر ہوتی جا رہی تھی، ماں کی صحت سے مطمئن ہو کر وہ گھر آگئے منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے تبدیل کئے، اتنے میں صدف چائے بنا کر لے آئی تھی، لیجئے بھائی جان چائے حاضر ہے۔

”شکریہ بہت تحکیم ہو رہی ہے تمہیں۔ ذیشان نے کہا تو صدف ناراض ہوتے ہوئے کہنے لگی اس میں تحکیم کیسی، اگر آپ ایسا محسوس کرتے ہیں تو لے آئیے ایک عدد بھائی ہم سب کیلئے تاکہ ہم سب کی تحکیم دور ہو۔“ صدف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر کہنے لگی، ”لیکن وہ خوبصورت ہونا چاہیئے بالکل آپ کی طرح۔“

”ٹھیک ہے سوچیں گے۔ انھوں نے صدف سے کہا پھر کچھ لمبے توقف کے بعد کہنے لگے، پہلے امی جان کو صحت مند ہو کر گھر لوٹ آنے دو پھر تم لوگوں کی مراد بھی بہت جلد بر آئے گی۔“ ذیشان نے کہا تو صدف معنی خیز مسکراہٹ لئے رازداری سے پوچھنے لگی، ”کیوں بھائی جان کہیں کسی نے آپ کے دل کو گھائل تو نہیں کر دیا؟“ پھر چائے کا کپ سہیلے مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

صدف کے جانے کے بعد ذیشان نے سگریٹ جلایا اور گہرا کش لیتے ہوئے کھڑکی تک چلے آئے، اور دور تک دیکھتے ہوئے کسی خاص سوچ میں گم ہو گئے یہ سچ تھا

کہ عندلیب ان کے حواس پر چھا گئی تھی۔ وہ جب سے اسپتال سے لوٹے تھے ان کے حواس گم تھے۔ عندلیب ایک پل بھی ان کے تصور سے جٹ نہیں پاتی تھی۔ انھوں نے ایک بے ایک حسین لڑکی دیکھی تھی لیکن کسی نے بھی انھیں اس قدر متاثر نہیں کیا تھا جس قدر عندلیب کا سانولہ سلوتا حسن ان کے احسانات میں رچنے بسنے لگا تھا۔ جب کہ وہ گھر لوٹے تھے عندلیب ہی کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ اس کا عمر پانچ بار بار ان کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا تھا۔ اس کا اوڑھنی سے ڈھکا ہوا سر بڑی بڑی بھیل جیسی آنکھیں، ستواں ناک اور نمکین سانولی رنگت، اس پر اس کا وہ پراعتقاد الحبہ شہرہ کا احتیاط سے چلنے گا۔ یہ جملہ بات یاد ان کے ذہن میں گونج رہا تھا وہ بے اختیار ہوئے جارہے تھے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ان کی ایسی حالت تو کبھی یہ ہوتی تھی وہ ایک مضبوط کردار کے مالک تھے۔

تب ہی ان کے اندر سے ان کے ضمیر نے انھیں آگاہی دی۔ وہ تمہیں بٹھا گئی ہے۔ فلشان تمہیں پسند آگئی ہے تمہارے دل کے نازک تلووں کو جھنجھٹا دیا ہے۔ اب نہ لے۔ اسی کا نام محبت ہے۔ فلشان نے کیا یہ سچ ہے انھوں نے سوچا۔ بلیاں بصد فیصد سچ ہے۔ ان کے دل نے بھلا پھر اچانک ہی انھوں نے اپنے تئیں ایک فیصلے کے ڈال دیے۔ مطمن ہو گئے۔

بڑی بیگم عائشہ بیگم کمال صحت مزید ہو کر گھر لوٹ آئیں۔ ان کے بطن پر ہونے پر سب شایعہ ارچن صحت منایا گیا۔ اس جشن صحت میں یورپین کے پلے ہدا اصرار کرنے پر عندلیب بھی شریک ہوئی، نورین نے اس کا تعارف عندلیب سے کیا اور وہ ملا رہے۔ کر دینا سچ بھی ان نے بے حد بہادری سے پختا تھا لیکن پھر بھی عازبہ نظر لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سہاوی اور پناہ پر کن چھلک چھلک پڑتی تھی۔ فلشان بھی کیلبدان سب کی نفروں سے بچ کر اسے دیکھتے رہے تھے اور نفروں ہی نفروں میں اسے اپنے دل میں اگل دینے لگے تھے۔

لہذا یہ دو عجب چمن صحت کے ہنگامے سے ہی ہمدردی سے فلشان نے اپنی امی عائشہ

بیگم کو اپنی پسند سے آگاہ کیا تو وہ حیرت زدہ رہ گئیں اور کہنے لگیں۔
 لیکن بیٹے وہ تمہارے معیار کے قابل قطعی نہیں ہے اور ہمارے اور ان کے
 گھرانے کا تفاوت و فرق بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا وہ بہت کمزور حیثیت کی حامل
 ہے تمہارا اور ان کا چلنا یا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے اور پھر میں نے تو یہ سوچ رکھا
 تھا کہ کوئی چاند ہی ہو ملے گا توں کی تمہارے یعنی اس عاشرہ بیگم بنی کہا تو فیضان شاد
 ہوتے ہوئے کہنے لگا۔

اسی جہان نظاہری حسین اور نال و دولت کا میں قطعی قابل نہیں لڑکی کا باطن
 حسین ہو یا کروار اور پاکیزہ ماحول میں پل رہی لڑکی پر اس صاف کی حامل ہوتی ہے بھلے ہی وہ
 کسی غریب گھر کی کیوں نہ ہو یا اس اعتبار سے ہیں مجتہد ہوں میرا محتاج غلط نہیں ہے
 آپ کو قطعی مایوسی نہیں ہوگی اسی جہان یہ میرا دعویٰ ہے بیفتان نے پورا اعتماد لے لیا
 کہا تو عاشرہ بیگم کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔

یہ سب سنا کر انھوں نے انجمن بھیک سے بیفتان بیٹے میں تمہارے خیالات کی قدر کرتی ہوں
 روئے تو عندیہ یہ تھا کہ بہت پسند ہے بہت خیریت کی ہے اس نے میری لیکن میں نے
 کبھی اس نظریہ سے نہیں سوچا تھا میں تمہارے ابو سے بات کر لوں گی پھر تمہیں بتاؤں گی
 عاشرہ بیگم نے کہا تو وہ چپ چاپ وہاں سے چلے گئے۔

اسی جہان نے سچ ہی تجاہد کیا کہ لگن چکی ہو اور چاہتا ہے اخلاقی ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور
 انعام سے نوازا کرتا ہے علیٰ شب بیگم نے جیسے ہی زہرا حسین کو فیضان کے خیالات سے آگاہ کیا
 تو وہ بہت خوش ہوئے انھیں اپنے ولی عہد پر تازہ مونیہ لگا کر لکھنے اور نچے خیالات کا خاکہ
 ہے ان کا بیٹا۔ انھوں نے عاشرہ بیگم سے کہا جب فیضان کو لڑکی پسند چلی تو ہمیں کیا

اعتراف ہو سکتا ہے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے
 پھر دیکھتے ہی دیکھتے چٹ منگنی اور پٹا بیلا کی خیاریاں مٹا لگیں زہرا حسین
 کے کہنے پر عابد حسین نے بھی عاشرہ بیگم سے کہہ ڈالا تھا اور انہیں دونوں شاد ہیں کی
 پیار بیلان زبوروں پر تھیں حسین میزل میں پھر ایک بار نچل چل پھل تھی کوٹھی کو دس

کی طرح سجایا جا رہا تھا۔

لڑکیوں کی محفلیں بھی خوب جمنے لگی تھیں، صدف، ملیحہ اور نادیا تینوں نے عندلیب کو عائشہ بیگم کے دعوت جشن صحت میں دیکھا ہوا تھا اس لئے وہ حیران تھیں کہ ذیشان بھائی اسے کیسے پسند کر بیٹھے۔ نادیا کی ساری امیدوں پر چونکہ پانی پھر چکا تھا اس لئے وہ بڑھ چڑھ کر بول رہی تھی، ”ذیشان بھائی کی پسند اتنی گھٹیا ہوگی میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“

اس کی اس بات پر نورین کو بے حد غصہ آیا اس نے کہا، تمہیں پتہ نہیں عندلیب بے انتہا خوبیوں کی مالک ہے اور پھر کیا کمی ہے بے چاری میں، بال اتنے دراز اور خوبصورت کہ دیکھتے ہی رہ جاؤ، گہری جھیل جیسی چمک دار آنکھیں ستواں ناک اور چہرے پر ہلاکی مٹھاس صرف رنگ ہی تو تھوڑا سا کم ہے۔ ظاہر ہے خدا نے ہر شخص میں کچھ نہ کچھ کمی ضرور رکھی ہے۔“

”ہاں نورین یہ بات تو تم نے صد فی صدیچ کمی ہے اگر رنگ کو نظر انداز کر دو تو عندلیب واقعی بہت پیاری لڑکی ہے، یوں کہو کہ دیکھنے والی نظر چاہیے“ ملیحہ نے نورین کی تائید میں کہا۔

جب ذیشان بھائی نے انھیں پسند کیا ہے تو ظاہر ہے ان سے متاثر ہو کر ہی پسند کیا ہوگا۔! ویسے بھی ذیشان بھائی ظاہری حسن پر مرنے والے شخص نہیں ہیں وہ بڑی گہری نظر رکھتے ہیں، اب اگر کسی کو ایسی ہوتی ہو تو اس میں ان بے چاروں کا کیا قصور ہے“ صدف نے نادیا پر چوٹ کی، جس کی تاب نہ لا کر وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تو ان تینوں کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ مبارک گھڑیاں بھی آن پہنچی دونوں بھائیوں کا نکاح ایک ایک دن کے وقفے سے ہوا دعوت ولیمہ مشترک رکھی گئی، شہر کی باعزت اور معزز ہستیوں نے شادی کی محفل کو رونق بخشی اور ڈنر میں شریک ہوئے۔

عندلیب ذیشان کی پہلی پسند بن کر ان کی شریک حیات بن گئی، اس نے سوچا

بھی نہ تھا کہ وہ اتنے بڑے گھر کی بہو اور ایک خوب رو اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کی شریک حیات بن جائے گی۔ اس نے اپنے مالک حقیقی کے آگے سجدہ ریز ہو کر اس انعام پر شکر ادا کیا اور اپنے اس گھر اور اس کے مکینوں کے دل جیسے تنے کے جتن کرنے لگی، پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ہر ایک کو اپنا گرویدہ کر لیا، ہر ایک کی زبان پر عندلیب ہی کا نام تھا، عائشہ بیگم بھی اس کی سلیقہ مندی اور سعادت مندی کی قائل ہونے لگیں۔ فیضان خوش تھے کہ ان کا انتخاب غلط نہ تھا ایک ایسی لڑکی شریک حیات کے روپ میں ملی تھی جو ان کے گھر کو واقعی نمونہ جنت بنا سکتی ہے۔

ادھر عامر شدید الجھنوں میں گرفتار تھا کیوں کہ اس کی دلن ایک ہندی اور ہٹ دھرم قسم کی لڑکی تھی، دیکھنے میں بے حد حسین تھی شہر کے ایک بہت بڑے بزنس مین کی اکلوتی اولاد تھی جسے بے جالا ڈیپیار نے کھیں کا نہ رکھ چھوڑا تھا اس کے پاس نہ ہی بڑوں کی عزت تھی نہ ہی چھوٹوں سے پیار، اپنی ساس کی کسی بات کو مانتا اپنی بے عزتی تصور کرتی تھی، شوہر کے کسی کام کو کرنا اپنی بے عزتی مانتی تھی، ساس سسر کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی، نام شاہانہ تھا تو اطوار بھی شاہانہ ہی تھے صدف اپنی بھال کی ایک ایک حرکت نوٹ کرتی اور اس کا مقابلہ عندلیب بھابی سے کرتی تو اسے احساس ہوتا کہ شاہانہ عندلیب کے پاؤں کی گرد کو بھی نہ چھو سکتی تھی، اس نے دل ہی دل میں فیضان کی پسند کو سراہا اور اپنے دوسرے بھائی کی قسمت پر اسے افسوس ہونے لگا۔

صالہ بیگم کی زبانی جب عائشہ بیگم نے عامر کی دلن شاہانہ کے بارے میں سنا جو کہ دیکھنے میں پری جمال حسن کی مالک تھی لیکن سیرت سے خالی، دل ہی دل میں انھیں اپنی بہو عندلیب اتنی خوبصورت لگی کہ خوشی کے احساس کے زیر اثر انھوں نے نورین کو آواز دی ”نورین اد نورین۔ کہاں ہو تم ذرا ادھر تو آنا۔“

”جی امی ابھی آئی“ کہتی ہوئی نورین بھاگی بھاگی چلی آئی۔ ”ذرا اپنی بھابی کو تو بلالاد“ انھوں نے نورین کو ہدایت دی۔ ”جی ابھی بلانی۔“ کہتی ہوئی وہ عندلیب کے کمرے کی جانب دوڑی چلی گئی، پھر کچھ ہی لمحے بعد وہ اپنی بھابی عندلیب کے ہمراہ عائشہ بیگم کے سامنے موجود تھی۔

”آداب امی جان بچی جان“ عندلیب نے بڑے ہی ادب و احترام سے عائشہ بیگم کو سلام کیا۔ وہ آج ملنے آ رہی تھی۔ شفا ساری میں جلوس تھی اور اس کا سناؤ لا جسنی نکھرا ہوا تھا۔ بعد بھلی لگ رہی تھی۔ عائشہ بیگم نے دل ہی دل میں اس کی بلائیں لیں اور کہا، جیتی رہو بیٹی۔ بسی عمر پاؤ۔ دونوں نے اسے دعاؤں سے نوازا۔ پھر عائشہ بیگم نے اپنے قریب بلایا اور سینے سے لگایا پھر کچھ لمبے توقف کے بعد کہنے لگیں، ”بیٹی آج خنے اس گھر کی ساری ذمہ داری میں تمہیں سونپ رہی ہوں۔ آج تمہیں ”بیورانی“ کا خطاب دیا جاتا ہے۔ پھر انھوں نے چاہیوں کا ایک وزنی گچھا عندلیب کی طرف بڑھایا تو وہ انھیں پھر پورا اعتماد سے سنبھالتے ہوئے عائشہ بیگم کے سینے سے جا لگی اور گویا ہوئی۔

”امی جان دعا کرو کہ میں یہ ذمہ داری بحسن خوبی نبھاسکوں۔“

دشیاں جو کچھ کچھ قبل وہ بے قدموں سے وہاں پہنچے تھے اس جذباتی منظر کو دیکھتے رہے ان کی اپنی آنکھیں بھی نم ہو چکی تھیں۔ انھوں نے دل ہی دل میں سوچا کہ بالآخر ان کی عندلیب نے ان کی ماں کا دل جیت لیا اور آج بیورانی بن چکی تھی۔ انھوں نے آخر ط مسرت اور محبت آمیز لہجے میں کہا۔

”میں تجھ سے ہر شے میں ہوں اور ان کے دوزخ کو گت نہیں ہمیں چاہئے بھی لے گی کہ نہیں۔“

ان کی آواز جیسے ہی عندلیب کی سماعت سے ٹکرائی وہ شرمائی ہوئی اپنی سارے ہی کا اچھل سہڑ والی ہوئی باورچی خانے کی طرف دوڑتی چلی گئی۔ اور عائشہ بیگم صالہ بیگم اور دشیاں کے چہروں پر خوشی نے بھر دیا۔

